پروفیسر محمود الٰہی (خصوصی شمارہ)

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ISSN 2581-5482

مارچ۔مئی ۲۰۱۹ء

قیمت: ۲۵/روپے

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

کوائف

کوائف

نام: محمود الٰہی   تخلص: زخمی

پیدائش: ۲ ستمبر ۱۹۳۰ء   وفات: ۱۹/ مارچ ۲۰۱۴ء

والد کا نام: مولانا علیم اللہ   آبائی وطن: ٹانڈہ، امبیڈکر نگر

تعلیم

۱۔ مولوی ۱۹۴۳ء مدرسہ کنز العلوم، ٹانڈہ   ۲۔ عالم ۱۹۴۴ء مدرسہ کنز العلوم، ٹانڈہ

۳۔ فاضل ۱۹۴۶ء مدرسہ کنز العلوم، ٹانڈہ   ۴۔ ہائی اسکول ۱۹۴۷ء (یوپی بورڈ)

۵۔ انٹرمیڈیٹ ۱۹۵۲ء (یوپی بورڈ)   ۶۔ گریجویشن ۱۹۵۳ء، آگرہ یونیورسٹی، آگرہ

۷۔ پوسٹ گریجویشن ۱۹۵۵ء آگرہ یونیورسٹی، آگرہ

۸۔ پی ایچ-ڈی، ۱۹۵۸ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ملازمت

اسسٹنٹ پروفیسر

(۱۹۵۸ء صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور)

پروفیسر (۱۹۷۲ء)

سبکدوشی

(جون ۱۹۹۱ء)

اعزازی عہدے

۱۔ دو-دو سال کی مدت کیلئے تین بار اترپردیش اردو اکادمی کے چیرمین

(۱) فروری ۱۹۸۱ء تا اگست ۱۹۸۳ء (۲) جون ۱۹۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۹ء (۳) جولائی ۱۹۹۳ء تا مارچ ۱۹۹۴ء

۲۔ اعزازی لائبریرین، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

۳۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹ، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

۴۔ کارگزار وائس چانسلر گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

تالیفات

۱۔ صحیفۂ محبت   ۲۔ اردو کا پہلا ناول 'خط تقدیر'   ۳۔ نکات الشعراء میر

۴۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ۵۔ بازیافت ۶۔ فسانہ عجائب کا بنیادی متن

۷۔ تذکرہ شورش   ۹۔ الہلال کے تبصرے   ۱۰۔ انتخاب تذکرہ

۱۱۔ انتخاب ہفتہ وار پیغام   ۱۲۔ انتخاب خطبات خلافت

۸۔ الہلال والبلاغ کی ترتیب وتدوین (تین جلدیں)

مارچ تا مئی ۲۰۱۹ء

ISSN 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ADBEE NASHEMAN

Email
adbeenasheman@gmail.com

قیمت

فی شمارہ : ۲۵/روپے

سالانہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک: ۱۲۵/روپے

بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک): $ 15 (امریکی ڈالر)

لائف ٹائم ممبرشپ : دو ہزار روپے

لائبریری/ادارہ کیلئے : ۶۵/روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن

168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ 226003

Bank Detail

Name : Ahmad Rashiq
Bank : Allahabad Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No. : 50099531558
IFSC : ALLA0212170

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168, Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

Mob.: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر

رفعت عزمی

Mob.: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

- پروفیسر انور ظہیر انصاری (بڑودہ)
- ڈاکٹر غلام حسین (اجین)
- ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
- وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
- ڈاکٹر شکیل احمد (مئو)

تزئین کار: وقار حسین رضوی

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے چھپوا کر 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عناوین

اداریہ

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ۴

ابتدائیہ

حمد ۳

نعت ۳

حرف آغاز

ادبی سومناتھ کا محمود .... پروفیسر مجاور حسین ۶

باب اول: اندازِ تحریر

میں نے فراق کو دیکھا تھا .... پروفیسر محمود الٰہی ۱۰

لکھنؤ اسکول اور قصیدہ نگاری .... پروفیسر محمود الٰہی ۱۲

باب دوم: تحقیق و تنقید

پروفیسر محمود الٰہی زخمی کا ادبی و شعری منظر نامہ ....
پروفیسر انور ظہیر انصاری ۱۶

پروفیسر محمود الٰہی کا شعری سروکار .... ڈاکٹر غلام حسین ۲۱

پروفیسر محمود الٰہی بحیثیت محقق .... ڈاکٹر مجاہد الاسلام ۲۶

پروفیسر محمود الٰہی کی طنزیہ تحریریں .... ڈاکٹر شکیل احمد ۳۵

پروفیسر محمود الٰہی اور مقدمات کتب و رسائل ....
ڈاکٹر ثوبان سعید ۳۹

تحقیق کے رمز شناس؛ محمود الٰہی ....
ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری ۴۵

پروفیسر محمود الٰہی اور مقدمۂ الہلال ....
انس مسرور انصاری ۵۳

اردو تحقیق کی آبرو؛ پروفیسر محمود الٰہی .... داؤد احمد ۵۹

پروفیسر محمود الٰہی 'پیش لفظ' کی روشنی میں ....
ڈاکٹر رضوان انصاری ۶۳

باب چہارم: تاثرات

پروفیسر محمود الٰہی؛ اردو کے مجاہد .... ڈاکٹر انعام الحق ۷۰

ایک شفیق استاد؛ پروفیسر محمود الٰہی .... ڈاکٹر ذاکر حسین ۷۳

پروفیسر محمود الٰہی اور چند سنہری یادیں .... ڈاکٹر امین احسن ۷۹

باب ششم: متفرقات

پروفیسر محمود الٰہی کی تخلیقات ۸۸

محمود الٰہی کی خطوط نگاری .... ڈاکٹر سلیم احمد ۸۹

خراج عقیدت .... آزاد ضمیر انصاری ۹۴

خراج عقیدت (قطعات) .... ظفر اقبال ظفرؔ ۹۴

باب ہفتم: چلتے چلتے

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے .... ڈاکٹر اکبر علی ۹۶

میرے کتابی استاد؛ پروفیسر محمود الٰہی .... صالحہ صدیقی ۹۸

باب سوم و پنجم: غزلیں اور نظمیں

محبت کوئی گناہ نہیں .... ۶۶ | انگڑائی ۶۶

جنونِ محبت .... ۶۷ | محسوسات ۶۷

محسوسات .... ۶۸ | بنکر ۶۸

صبح نو .... ۸۴ | صبح آزادی ۸۴

میرا عزم .... ۸۵ | مجاہد ۸۵

گاندھی جی .... ۸۶ | متفرق اشعار ۸۶

تبصرے

اردو فکشن کے پانچ رنگ .... مصنف: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

مبصر .... شاداب اختر فلاحی ۱۰۲

اردو کی عصری صدائیں .... مصنف: ڈاکٹر غلام نبی کمار

مبصر .... ڈاکٹر خوشتر منصور ۱۰۳

مراسلات

خطوط ۱۰۴

□□□

حمد باری

حامد و حمد و محمود پروردگار
خلق کا تو ہے مسجود پروردگار

منحصر تجھ پہ ہے زندگی کا مآل
بندگی کا تو مقصود پروردگار

ہم ترے عبد بھی اور عابد بھی ہیں
تو ہمارا ہے معبود پروردگار

تیرے در کی سوالی ہے کل کائنات
تجھ سے سب کی ہے بہبود پروردگار

پاک ہے تو مکاں سے مگر ہر جگہ
تیرا جلوہ ہے موجود پروردگار

رشکِ حور و ملک اس کی بن جائے ذات
جس کو کہہ دے تو مسعود پروردگار

تیری وحدانیت پر ہے قدسی نثار
شاہد، آقا تو مشہود پروردگار

سید اولاد رسول قدسیؔ
نیویارک (امریکہ)

نعت

ملتی رہی قلم کو سعادت کی روشنی
در آئی حرف حرف میں مدحت کی روشنی

آنے سے آپ کے ہوئیں کافور ظلمتیں
عالم میں پھیلی آپ کی رحمت کی روشنی

غارِ حرا میں لے کے جو آئے تھے جبرئیل
سچا کلام نور، ہدایت کی روشنی

تا حال ہو رہی ہے وہ برسات نور کی
لمحے نے پائی تھی جو زیارت کی روشنی

ایثار و درگزر کا سبق آپ نے دیا
پھیلائی آپ نے ہے اخوت کی روشنی

عورت کو بخشی آپ نے آخر حیات نو
اس کو ملی ہے عزت و عظمت کی روشنی

صبح و مسا ہے نازؔ کی بس آرزو یہی
میری نواح جاں میں ہو سیرت کی روشنی

سمعیہ ناز
لیڈز (یوکے)

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

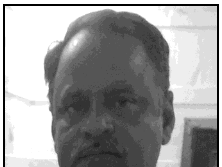

یگانہ روزگار، محقق و نقاد پروفیسر محمود الٰہی نے زخمی تخلص اختیار کرتے ہوئے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا سفر ضرور شروع کیا مگر بہت جلد اسے ترک کر کے تحقیق وتنقید کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ گرمیوں کی پوری تعطیل مختلف شہروں کے کتب خانوں کی گرد آلود کمروں میں کتابوں اور خطی نسخوں کی دریافت میں گزار دیتے۔ انہوں نے دنیا کے قدیم ترین دیوان حافظ کا نسخہ جونپور کی خانقاہ رشیدیہ سے دریافت کیا جو حافظ شیزازی کے حین حیات کا خطی نسخہ تھا یہ بات الگ ہے کہ انہوں نے اس بیش قیمتی نسخے کو ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ کو اس عذر کے ساتھ نذر کر دیا کہ فارسی ادب ان کا میدان نہیں ہے۔

فسانہ عجائب کا بنیادی متن، نکات الشعراء، تذکرہ شورش، اردو کا پہلا ناول- خط تقدیر ہو یا پھر ان کا تحقیقی مقالہ 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'، یہ ان کے وہ تحقیقی اثاثہ ہیں جس کی بنیاد پر انھیں ادب میں معتبر محقق اور نقاد کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' کو تلاش کر تحقیقی مقدمے کے ساتھ مرتب کرنا، انشاء پرداز مہدی افادی کے خطوط کے مجموعہ 'صحیفۂ محبت' کو ہم بھلا کیسے بھلا کر سکتے ہیں جب کہ باز یافت ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں کل دس مضامین شامل ہیں۔ اسی میں اردو ڈرامہ اور انارکلی کے عنوان سے شامل مضمون میں جو تجزیہ موصوف نے کیا ہے۔ اسے اب تک اردو تنقید کا حرف آخر مانا جاتا ہے جب کہ باقی مضامین ان کی تحقیقی تنقیدی علمی صلاحیت کو اجاگر کرتی ہیں جو یقینا اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے والے دستاویز ہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی صاحب دو-دو سال کی مدت کیلئے تین بار اتر پردیش اردو اکادمی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ اس دوران انہوں نے سیکڑوں کی تعداد میں نادر و نایاب کتابوں کے ساتھ بیحد کم قیمت پر نصابی کتابوں کی اشاعت جیسے کارنامے سرانجام دئے۔ آزاد صدی کے موقع پر ایک سو کتابوں کی سیریز پر جو پیش لفظ انہوں نے تحریر کیے وہ بھی ادبی اور تحقیقی حیثیت کے حامل ہیں اس پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ محمود الٰہی صاحب کی جہد تھی کہ انہوں نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ سے اپنے مراسم کا بھرپور فائدہ اٹھایا، جس کی وجہ سے قیصر باغ میں ایک کرایہ کے مکان میں واقع اردو اکادمی آج گومتی نگر میں اپنی عمارت میں قائم ہے۔ یقینا اسے اردو اکادمی کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔

۱۹۵۸ میں گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار

کے عہدے پر محمود الٰہی صاحب کا تقرر ہوا اور ۱۹۷۲ میں انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ طویل مدت تک تعلیم و تعلم سے وابستگی کے بعد ۱۹۹۱ میں وہ ملک کے سب سے سینئر پروفیسر کے طور پر سبکدوش ہوئے۔ اسی سال وہ گورکھپور یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر بھی مقرر ہوئے۔ موصوف نے اپنی ملازمت کے دوران یونیورسٹی سے ملحق ۲۷ ڈگری کالجوں میں اردو درس و تدریس کا نظم بھی کرایا، جس سے اردو کی ترقی اور اردو سے روزی روٹی کے راستے وا ہوئے۔ ان کی نگرانی میں ایک ڈی لٹ اور ۳۶ پی ایچ ڈی کے مقالوں پر ڈگری ایوارڈ ہوئیں۔ ۱۹؍ مارچ ۲۰۱۴ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

اس لحاظ سے محمود الٰہی صاحب کی اس پانچویں برسی کے موقع پر ادبی نشیمن پریوار نے ان کی سنہری ادبی خدمات کے اعتراف میں اس شمارہ کو موصوف کے نام خصوصی طور پر منسوب کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ ان کی تمام تر ادبی خدمات کا احاطہ کیا جا سکے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے اسلاف کی خدمات کو یاد کرنے اور اس یاد کو تازہ کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً بہانہ تلاش کر لینا چاہئے۔ ورنہ 'کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'۔ یقینا موصوف کی اس پانچویں برسی پر یہ خصوصی شمارہ اسی بہانہ کی ایک کڑی ہے۔

۱۹۱۹ء میں خلافت اسلامیہ کے تحفظ اور ہندوستان میں برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے تحریک خلافت کمیٹی عمل میں آئی۔ مسلمانوں کی اس خالص مذہبی تحریک میں گاندھی جی کے شامل ہو جانے سے ملک کے تمام بڑے رہنماؤں کی حمایت حاصل ہو گئی اور ہندو مسلم متحد ہو کر اس لڑائی میں شامل ہو گئے لیکن جب ترکی سے خلافت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان ہو گیا تو پھر تحریک خلافت ملک کی آزادی کی لڑائی میں شامل ہو گئی۔

اسی طرح تحریک خلافت کمیٹی نے قومی یکجہتی اور تحریک آزادئ ہند میں جو کردار ادا کیا وہ تو تاریخ کا اہم باب ہے جب کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں جلیاں والا باغ قتل عام کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جنرل ڈائر کے حکم سے یہ حادثہ ۱۳؍ اپریل ۱۹۱۹ء میں وقوع پذیر ہوا جس میں چار سو سے پانچ سو ہندوستانی شہید ہوئے۔ تحریک خلافت کمیٹی کی تشکیل اور جلیاں والا باغ قتل عام کو ۲۰۱۹ء میں سو سال ہونے کو ہیں۔ اس مناسبت سے جاریہ سال کو صد سالہ یادگاری سال کے طور پر منانا ہمارا قومی اور ملی فریضہ ہے۔

جس وقت ادارہ خصوصی رسالے کی تیاری میں منہمک تھا، تبھی ۱۶ جنوری کو محمود الٰہی صاحب کی اہلیہ کا لکھنؤ میں اور ۱۸ جنوری کو معروف افسانہ نگار اقبال مجید کا طویل علالت کے بعد بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ ادارہ ان دونوں بزرگوں کے غریق رحمت ہونے کی دعا کرتے ہوئے اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ادبی نشیمن کی مجلس ادارت کے ایک تعزیتی جلسہ کے دوران پلوامہ میں ہوئے دہشت گردانہ حملے میں شہید ہونے والے جوانوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور اس بزدل اور سفاک حملے کی سخت مذمت کی گئی۔

اس خصوصی شمارے میں شامل تمام قلمکاروں کا میں مجموعی طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری ایک درخواست پر بلا معاوضہ اور بلا ناز و نخرے کے اپنے مضامین حوالۂ قلم کئے۔ یقینا یہ وہ قلمکار ہیں جو صدق دل سے ادب کی خدمت میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایسے بے لوث، بے مقصد اور مخلص قلمکاروں کو ادارہ ادبی نشیمن سلام کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

ادبی سومناتھ کا محمود

پروفیسر محمود الٰہی پر شمارہ کرنے کا ارادہ کیا تو بے ساختہ پہلا خیال جن کا افراد کا ذہن میں آیا، ان میں سرفہرست پروفیسر مجاور حسین صاحب کا نام شامل تھا۔ افسوس کہ ظاہری طور پر ملاقات تو نہیں ہو سکی البتہ فون پر درخواست کی تو بخوشی راضی ہو گئے لیکن حالات اور عمر کے تقاضے کے تحت انہوں نے بتایا کہ میں خود تو نہیں لکھ سکتا لیکن فون پر ہی ضرور لکھوا سکتا ہوں۔ وقت اور دن طے ہوا اور پھر معینہ روز فون پر فی البدیہہ پورا مضمون تحریر کرا دیا۔ ادارہ ان کے اس گرانقدر تعاون کی خاطر شکر گزار ہے۔ (ایڈیٹر)

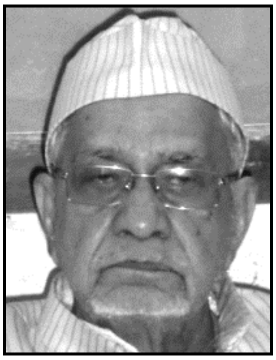

پروفیسر مجاور حسین

4/14، آفیسرس کالونی

ڈالی باغ، لکھنؤ

رابطہ: 7376811599

۱۹۵۱ء میں ہم لوگ نکہت کلب کی کانفرنس کرنے گورکھپور آئے تھے۔ ملک زادہ منظور احمد جو میرے ہم جماعت، دوست، ہم نشین، ہم محلہ اور ہمسایہ، ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، انہوں نے یہ تجویز رکھی تھی کہ نکہت کلب کا جو رسمی اجلاس ہے اس کے بعد ایک مشاعرہ رکھ دیا جائے اور اس مشاعرے کی وجہ سے نکہت کی تشہیر بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ بات تسلیم کر لی گئی اور نکہت کلب کانفرنس کے بعد ایک مشاعرے کا اہتمام رکھا گیا۔ شعراء کا انتخاب منظور صاحب کے ہی سپرد تھا۔ شعراء میں تبارک اللہ اور عمر قریشی، ستیش چندر یہ تین آدمیوں کی کمیٹی تھی جنہوں نے شعراء کا انتخاب کیا تھا۔ شعراء میں ہم لوگوں کے ساتھ مصطفی زیدی تیغ الہ آبادی، اسرار احمد ناروی (ابن صفی)، اجمل اجملی وغیرہ تھے۔ گورکھپور سے ہندیؔ گورکھپوری اور راہی معصوم رضا، میکش غازی پوری وغیرہ۔ باہر کے شعراء میں منظور نے بتایا کہ زخمیؔ ٹانڈوی آرہے ہیں۔ مشاعرہ شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے دوپہر میں ایک چھوٹی بحر کے شاعر منظور کے گھر کے طویل دالان میں داخل ہوئے اور منظور نے ایک زوردار نعرے کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے مجھ سے کہا: یہ زخمی صاحب ہیں اور ان سے کہا، یہ مجاور! میرے ہم جماعت اور نکہت کے ایڈیٹر۔ بات ختم ہو گئی۔ ہم لوگ انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ شام کو انصار ہائی اسکول میں مشاعرہ ہوا۔ اس میں شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ تقریباً ہر شاعر کامیاب رہا لیکن اپنے ترنم کی بنا پر عرف عام میں زخمیؔ صاحب نے عباس حسینی صاحب کے لفظوں میں سب شعراء کو قتل کیا اور مشاعرہ لوٹ گیا۔ ان کو قاتل الشعراء کا خطاب عباس حسینی نے دیا تھا۔ اس میں سے کہیں تھا کہ زخمیؔ صاحب کا نہ صرف ترنم اچھا تھا بلکہ جو غزل انہوں نے پڑھی تھی وہ بھی معنوی اعتبار سے بہت خوب تھی۔

وقت پُھر سے اڑ گیا............

منظور نے مجھے ۵۸-۱۹۵۷ء میں اطلاع دی کہ وہ اردو سے ایم اے کرنے جا رہے ہیں اور یہ کہا ایک صاحب آئے ہوئے ہیں 'اماں وہی محمود الٰہی! جو زخمیؔ ٹانڈوی تھے جن سے تمہیں ملا چکا ہوں۔ وہ گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے وحدہ لاشریک ہیں۔ تم کب آ رہے ہو؟ آؤ تو ملائیں۔'

اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے ایک خاندانی مراسم کی بنا پر غازی روضہ میں رحمان خاندان میں جانا پڑا۔ شادی کی تقریب تھی۔ جس وقت کھانا کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک صاحب آتے ہوئے نظر آئے۔ چہرے سے لگتا تھا کہ ان کو کبھی دیکھا ہے مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔ حیرت اس وقت ہوئی جب وہ ان گھیرے ہوئے لوگوں کے درمیان میری طرف بڑھے اور بڑی محبت سے کندھے سے ہاتھ رکھ کر کہا، کہئے! مجاور صاحب! کیا حال ہے؟ آواز سنی تو مانوس آواز کی بنا پر حافظہ نے انگڑائی لی اور یاد آ گیا کہ یہ تو وہی حضرت زخمیؔ ہیں ہم دونوں نے معانقہ کیا پھر دسترخوان پر پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔

معلوم یہ ہوا کہ انہوں نے منظور کو ایم اے تو پاس کرایا ہی، پی ایچ ڈی بھی اپنی نگرانی میں کرائی ساتھ ہی انہوں نے ایم اے ثلاثہ (تاریخ، انگریزی اور اردو) کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے لی اور گورکھپور یونیورسٹی میں محمود الٰہی صاحب کے رفیق کار ہو گئے تھے۔ منظور کی مزاج کی سیمابی کیفیت نے انہیں گورکھپور ٹھہرنے نہیں دیا اور وہ کئی جگہ کا سفر کر کے لکھنؤ یونیورسٹی میں آ گئے۔ محمود الٰہی صاحب اب زخمیؔ نہیں رہ گئے تھے بلکہ ادب کے دیدہ ور محقق اور نقاد ہو چکے تھے۔ ان کی کتاب 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' نہ صرف یہ کہ الف سے لے کر ی تک خود پڑھنا پڑا بلکہ وہ ایم اے کے نصاب میں بھی داخل ہو گئی۔ اسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ بعض جگہوں پر علم و ادب ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں جیسے شفق کے رنگوں کی آمیزش میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کدھر کا رنگ زیادہ شوخ ہے۔ سرخ والا یا ہلکا سرمئی۔ اس کتاب میں محمود الٰہی صاحب نے پوری تاریخ عربی قصائد کی بھی بیان کر دی تھی۔ ہم لوگ سبعۂ معلقہ سنا پڑھا تھا لیکن شعراء سے نام سے واقف نہیں تھے مگر محمود الٰہی صاحب نے امراء القیس سے عنترہ بن شداد تک کے نام یاد کروا دئے تھے اور ہم لوگ آپس میں یہ سوچنے لگے کہ یہ وہی زخمیؔ ہے جس سے ہم ملے تھے یا یہ کوئی دوسری شخصیت ہے۔ انہوں نے قصیدے کا اتنا بھرپور تعارف کرایا کہ وہ صنف جو صرف مداحی یا بھاٹ پن یا تملق، خوشامد و چاپلوسی تک محدود سمجھی جاتی تھی، الٰہی صاحب کی وجہ سے یہ معلوم ہوا کہ واحد صنف ہے جو غزل کی طرح سڑک پر گانے والی نہیں ہے بلکہ علماء، افاضل اور ادیب اپنی نشستوں میں اس پر مباحثے کرتے تھے خاص طور سے منیر شکوہ آبادی کا مشہور قصیدہ 'اشک زلیخا ہوئے بحر صفت موجزن' پڑھ کے یہ معلوم ہوا کہ اردو کسی حالت میں فارسی کی کنیز نہیں ہے بلکہ سہیلی ہے۔

الٰہی صاحب نے خط تقدیر سے بھی متعارف کرایا۔ انہوں نے اپنے قلم کی ساری توانائی صرف کی لیکن ہم لوگوں نے اسے اردو ناول نگاری کا نقش اول ماننے سے انکار کر دیا اور اسے صرف تمثیل کا درجہ دیا۔ اس اختلاف پر نہ تو وہ برہم ہوئے، نہ ان کی پیشانی پر بل پڑا بلکہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ 'ادبی اختلافات در اصل وسیع القلبی اور ضمیر کی طہارت کا سبق سکھاتے ہیں اور اگر یہ اختلافات نہ ہوں تو انسانیت و یک رنگی امکانات کے دروازے بند کر دیتی ہے۔'

وہ تقریر کے آدمی نہیں تھے، تحریر کے بادشاہ تھے لیکن کبھی کبھی اگر موڈ میں آتے تو بڑے اچھے لیکچر دیتے۔ ان کی شہرت بحیثیت استاد اور محقق بہت دور تک پھیلتی گئی۔ میں جب حیدرآباد یونیورسٹی میں تھا، اسی زمانے میں انہوں نے 'نکات الشعراء' مرتب کیا، اس میں ۱۰۳ شعراء کا ذکر تھا۔ اس سے پہلے مرتبین ایک ۱۰۲ تک محدود رہے تھے۔ الٰہی صاحب کو مخطوطات سے دلچسپی تھی اور وہ مجھے اس پر اکساتے رہتے تھے کہ میں مخطوطہ شناس بن جاؤں۔ دراصل لفظ 'مخطوطہ' جب لکھا جاتا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے طوطا مرچا کھا رہا ہے۔ اس لئے میں ہمیشہ معذرت کرتا رہا۔ انہوں نے ڈاکٹر محمد حسن مرحوم کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور اس کا انتساب 'بوئے پیرہن بہ کنعان می رود' بہت مشہور ہوا۔ حالانکہ ان کے اور محمد حسن صاحب کے درمیان عمر کا زیادہ فاصلہ نہ تھا مگر وہ نہ صرف محمد حسن صاحب کا احترام کرتے تھے بلکہ ہر جگہ وہ بطور قائد سامنے لانے کی کوشش کرتے تھے۔ جب جنتا پارٹی الیکشن میں کامیاب ہوئی اور یوپی اکیڈمی کی از سر نو تشکیل ہوئی تو محمد حسن صاحب صدر اور محمود الٰہی صاحب چیئرمین ہوئے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جس زمانے میں مجھے تدریس سے وابستگی کا موقع ملا اور میں نے محمود الٰہی صاحب کو زحمت دی تو وہ ہر

موقع پر مخلصانہ تعاون کرتے رہے۔ایک سلیکشن کمیٹی میں وہ گیان چند کے ساتھ تھے۔میں نے جس امیدوار کی سفارش کی تھی گیان چند اس کے سخت خلاف تھے۔ یہ بات میں نے الٰہی صاحب کو بتادی تھی۔الٰہی صاحب اس کمیٹی میں تنہا پڑ گئے اور میرے امیدوار کو منتخب نہ کرا سکے۔ میں حسب معمول انہیں رخصت کرنے پہنچا، رکشہ پر وہ میرے ساتھ تھے۔ان کے چہرے پر حسب معمول بشاشت تھی۔میں ان کے لئے کالی گاجر کا ہلوا لے کے گیا تھا۔ رکشے پر ہم دونوں ساتھ تھے۔ جب رکشہ چل پڑا تب انہوں نے کہا کہ آپ مجھ سے بددل نہ ہوں۔ میں آؤٹ ووٹ ہوگیا۔گیان چند صاحب نے اپنے امیدوار کو منتخب کرا یا لیکن آپ کا امیدوار تیسرے نمبر پر ہے۔ابتدائی دو امیدواروں کی کوالی فیکیشن میں نے ریلیکس نہیں کی۔اب آگے آپ خود نکتہ رس ہیں۔اس پر آپ کے دوست ہیں اور وائس چانسلر آپ کے استاد رہ چکے ہیں۔ چنانچہ وہ انتخاب کالعدم قرار دیا گیا اور کمیٹی کی تشکیل نو ہوئی اور میرا امیدوار سی ایم پی ڈگری کالج میں میری جگہ کام کرنے لگا۔

میں نے واقعہ صرف اس لئے لکھا ہے کہ وہ اس کے بھی قائل تھے کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے اور اس کا لحاظ بھی رکھتے تھے کہ قاعدہ قانون کے مطابق ہر ایک کام ہو۔ ان سے چھوہڑ پن نہیں برداشت ہوتا تھا اور ایک طرح سے انہوں نے مجھے میر صاحب کا یہ شعر رٹا دیا تھا:

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے

جس زمانے میں وہ اردو اکیڈمی میں آئے تو میری کتاب 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر' پر انہوں نے پہلا انعام پانے والوں کی صف میں میرا نام بھی شامل کیا۔ میرے ساتھ ملک زادہ منظور احمد اور نیر مسعود تھے۔ یہ کچھ باتیں ان کی وضع داری ، نباہ کرنے کی عادت، تعلقات کو ایک سطح پر رکھنا اور محبتوں کے دروازے کو کبھی بند نہ کرنا جیسے اصول کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ کبھی تعلقات میں تلخی آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ کیا مجال جو ایک بال پڑ جائے۔الہ آباد یونیورسٹی میں جعفر رضا صاحب نے اردو اکیڈمی کے تعاون سے اکبرالہ آبادی پر سیمینار کیا۔ مجھے دعوت نامہ موصول ہوا اور میرے لئے جو موضوع منتخب کیا گیا وہ تھا 'اکبر کی غزل گوئی'۔

محمود الٰہی صاحب کے سامنے لوگوں نے یہ تجویز رکھی کہ اکبر الہ آبادی کو غزل سے کیا واسطہ؟ مجاور صاحب کو نہ بلایا جائے یا انہیں کوئی دوسرا عنوان دے دیجئے۔الٰہی صاحب نے کہا۔ نہیں! مجاور صاحب اسی عنوان پر لکھیں گے اور وہ نہیں آئیں گے تو میری غیر حاضری بھی درج کر لی جائے۔ چنانچہ میں نے 'دل آگاہ کا شاعر' کے عنوان سے اکبر کی غزل گوئی پر مقالہ لکھا اور وہ سیمینار میں بھی مقبول ہوا اور نیا دور میں بھی شائع ہوا۔جب میں نے مقالہ پڑھنا ختم کیا۔محمود الٰہی صاحب کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اور انہوں نے اپنی اختتامی تقریر میں بطور خاص اس کا ذکر کیا کہ اکبر کی شاعری کے ایک نئے گوشے سے آج ہم لوگ متعارف ہوئے۔

محمود الٰہی ایسی شخصیت کے مالک تھے جو ادبی دنیا میں اس اعتبار سے منفرد تھے کہ وہ عربی فارسی بالخصوص عربی ادب سے کماحقہ آگاہ تھے۔ وہ پانچ زبانوں کے آدمی تھے۔ اردو، عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی اور بعض وقت اتنی بے تکلفی سے ادبی مسائل پر گفتگو کرتے تھے جیسے معلوم ہوتا تھا کہ کتاب پڑھ رہے ہیں۔صفحہ کے صفحہ حوالے میں گناتے چلے جاتے تھے۔گورکھپور میں انہوں نے حقیقی معنوں میں اردو ادب کی تدریس کو ایک سمت اور منزل عطا کی۔وہ بے انتہا مقبول تھے اور ہمیشہ انہوں نے اس کا لحاظ رکھا کہ ان کے شاگرد ادب کی تدریس میں ان کی پیش کردہ روش کو اپنائیں۔انہیں اپنے شاگردوں پہ بڑا فخر تھا اور وہ ان کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا کرتے تھے۔جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ڈاکٹر عبدالحق حیدرآباد میں بہت مقبول ہیں تو وہ اس طرح اپنی مختصر سی داڑھی میں مسکرائے جیسے لگتا تھا کہ انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہے۔ وہ ہمیشہ بڑے احترام کے ساتھ ڈاکٹر محمد حسن کا ذکر کرتے تھے اور ان کے یہاں ایک تعلقات کی الماری تھی جس میں خانے بنے ہوئے تھے۔سب کا خانہ الگ الگ تھا۔محمد حسن، مجاور حسین، عبدالحق اور ملک زادہ منظور احمد، فضل امام، فیروز احمد اور ان کے علاوہ بہت سے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔سب کو جس طرح کے تعلقات تھے اس کی بنیاد پر آئین وضابطہ کے اندر فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ واقعی ان لوگوں میں سے تھے جن کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب کے چمن میں ایسی دیدہ ور جو ادبی رموز و نکات کے ساتھ الفت و محبت کے خزانے لٹاتا رہا ہو۔ یقینا ایسی شخصیت کئی صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔یہ لوگ وہ ہیں جو صرف کتابوں کے صفحات میں زندہ نہیں رہیں گے بلکہ جب تک دلوں میں دھڑکن رہے گی اس وقت تک زندہ رہیں گے۔

□□□

باب اول

انداز تحریر

میں نے فراقؔ کو دیکھا تھا

فراقؔ گورکھپوری پر یہ مختصر سا مضمون محمود الٰہی صاحب نے آل انڈیا ریڈیو گورکھپور کے لئے لکھا تھا جو ۲۸؍اگست ۱۹۹۶ء کو اردو پروگرام میں نشر ہوا۔ شکر گزار ہوں آل انڈیا ریڈیو گورکھپور کے فرخ جمال صاحب کا جنہوں نے اصل مضمون دستیاب کرایا۔(ایڈیٹر)

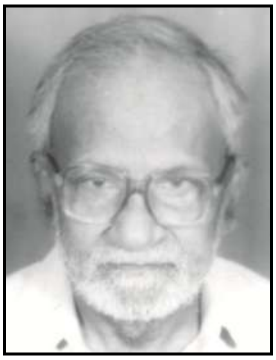

پروفیسر محمود الٰہی

فراقؔ گورکھپوری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھنے والے زیادہ تر وہ قلمکار ہیں جنہوں نے فراقؔ کو دیکھا تھا، الٰہ آباد یونیورسٹی میں ان سے فیض حاصل کیا تھا یا مشاعروں میں ان کا کلام سنا تھا۔ کچھ لوگوں نے اپنی دیدہ وری کو ان کی نامکمل آپ بیتی سے پروان چڑھایا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں فراقؔ کی مخصوص محفلوں میں رسائی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ان صدہا تحریروں نے نئی نسل پر یہ نقش ثبت کر دیا کہ وہ صرف ایک عہد ساز شخصیت نہیں تھے بلکہ کوئی داستانی یا افسانوی کردار تھے۔

آج فراقؔ کے لطیفے اور اضطراری لمحات کے زائیدہ واقعات عام طور پر دہرائے جا رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ان لطیفوں اور واقعات میں فراقؔ کو قید نہ کر دیا جائے اور ان کی دانشورانہ اور شاعرانہ جینیس نقاب اندر نقاب نہ ہو جائے۔

میں نے فراقؔ کو پڑھا زیادہ اور دیکھا کم اور دیکھنے کی یہ کمی میں نے ہمیشہ ان کے کلام سے پوری کی۔ ان کے پاس ایک شاعر کا دل اور ایک دانشور کا دماغ تھا جو باتیں وہ شعر میں نہیں کہہ سکتے تھے، انہیں اپنے کردار اور حرکات وسکنات سے بیان کر دیتے تھے۔ ان کے لطیفے اور ان کے سوانحی واقعات کی حیثیت گردِ کارواں کے علاوہ کچھ نہیں۔

ایک بار گورکھپور یونیورسٹی نے طے کیا کہ کسی عظیم مگر زندہ شاعر کا جشن منایا جائے اور اس شاعر کو تقریب میں مدعو کیا جائے۔ فراقؔ کے علاوہ کوئی دوسرا غیر معمولی ہم عصر نگاہ میں کیونکہ ٹھہر سکتا تھا۔ جشن فراقؔ کے اہتمام کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ شکستہ پائی اور درماندگی کے باوجود میں اس کوچے میں داخل ہوا۔ لوگوں نے بہت ڈرایا کہ فراقؔ کو جشن میں لانا آسان کام نہیں مگر فراقؔ سے چند ملاقاتوں

کے بعد ظاہر ہو گیا کہ یہ کام بھی آسان نکلا۔ نہ کوئی مطالبہ، نہ کوئی شرط، نہ کوئی نذرانہ اور نہ میزبانی اور مہمان نوازی کے تکلفات۔ وہ آئے اور جشن فراقؔ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ لطیفے اور چٹکلے بھی ساتھ رہے لیکن فراقؔ نے شاعری پر جو اظہار خیال کیا اور اس کے ثبوت میں انے جو اشعار پیش کئے وہ ان کے عمیق مطالعے کا آئینہ تھا۔ وہ دانشوروں کی محفل میں ایک دانشور کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ فراقؔ کے کلام کے آئینے میں ان کی دانشوری کے مطالعہ کی اہمیت ہمیشہ رہے گی۔

فراقؔ بیک وقت ایک مجاہد آزادی اور ایک شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ گرفتار کئے گئے اور آگرہ جیل ان کا مسکن بنا۔ انہوں نے جیل میں مشاعروں کا اہتمام کیا اور وہاں باقاعدہ شعری نشستیں ہوتی تھیں۔ فراقؔ نے جیل میں جو اشعار کہے، ان سے انداز ہو جاتا ہے کہ وہ ایک نئی روایت کا آغاز کر رہے تھے۔ بعض اشعار ملاحظہ کیجئے۔

دل ویراں کی یہاں سیر کیا کرتا ہوں
مانع دشت نوردی مجھے زنداں نہ ہوا
اہل زنداں کی یہ مجلس ہے ثبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

....

فراقؔ اک دوسری دنیا کی کچھ کچھ یاد آتی ہے
نہیں معلوم آئے ہیں جہاں میں ہم کہاں ہو کر

....

اردو ادب کا یہ مزاج رہا ہے کہ وہ نئے افکار اور نئے موضوعات کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ فراقؔ نے کئی کوشش کی کہ وہ اپنی شاعری کے لئے زیادہ سے زیادہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کو پرکھیں اور انہیں اردو کے مزاج میں ڈھالیں۔ وہ روایات کے منکر نہیں تھے لیکن نئی روایت کو قبول کرنے میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار قابل لحاظ ہیں۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

....

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

> آج فراقؔ کے لطیفے اور اضطراری لمحات کے زائیدہ واقعات عام طور پر دہرائے جا رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ان لطیفوں اور واقعات میں فراقؔ کو قید نہ کر دیا جائے اور ان کی دانشورانہ اور شاعرانہ جبینیں نقاب اندر نقاب نہ ہو جائے۔
>
> میں نے فراقؔ کو پڑھا زیادہ اور دیکھا کم اور دیکھنے کی یہ کمی میں نے ہمیشہ ان کے کلام سے پوری کی۔ ان کے پاس ایک شاعر کا دل اور ایک دانشور کا دماغ تھا جو باتیں وہ شعر میں نہیں کہہ سکتے تھے، انہیں اپنے کردار اور حرکات وسکنات سے بیان کر دیتے تھے۔ ان کے لطیفے اور ان کے سوانحی واقعات کی حیثیت گردِ کارواں کے علاوہ کچھ نہیں۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

....

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

....

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

موت کا بھی علاج ہو شاید
زندگی کا کوئی علاج نہیں

....

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

....

فراقؔ نئے افکار کی تلاش میں ہندوستانی صنمیات کا بار بار جائزہ لیتے ہیں اور پھر اپنی رباعیات اور منظومات میں انہیں پیش کرتے ہیں۔ آدھی رات، جگنو، پرچھائیاں، دھرتی سنگیت، ان کی کامیاب نظمیں ہیں جو فراقؔ کو ایک نئی منزل کا راہی ثابت کرتی ہیں۔ ان کی رباعی گوئی کی یہ دو مثالیں ملاحظہ کیجئے:

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جان بہار تجھ پر پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدو کو چھو لیتا ہوں

....

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلعت میں فراقؔ
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

آج بھی نئی روایات کی تعمیر وتشکیل میں لگے ہوئے ہیں۔ فراقؔ کے تجربات ان کے سامنے ہیں۔ انہوں نے فراقؔ کو دیکھا بھی ہے اور پرکھا بھی ہے لیکن یہ سوال آج بھی محتاج جواب ہے کہ کیا جدت طرازی میں انہوں نے فراقؔ کو بھی رہنما بنایا ہے۔ خود فراقؔ کے الفاظ ہیں:

'یاد رکھنا فراقؔ کو یارو'

(۲۸/اگست ۱۹۹۶ء)

❑❑❑

لکھنؤ اسکول اور قصیدہ نگاری

پروفیسر محمود الٰہی

دربای قصیدے کے فروغ وترویج کے لئے جس ماحول اور جن محرکات کی ضرورت بتائی جاتی ہے، اودھ میں ترقی یافتہ شکلوں میں ان کا وجود رہا ہے۔ وہاں شاعری دربار کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ سودا، میر، جعفر علی، حسرت، میر حسن، انشاء، مصحفی اور دہلی کے دوسرے مہاجر شعراء نے تاجداران اودھ کی مدح میں شاندار قصیدے کہے اور اس طرح درباری مداحی کی بنیاد وہاں مستحکم کی۔ سارا ملک تباہی اور بربادی کا شکار تھا مگر اودھ میں رنگ رلیاں منائی جارہی تھیں۔ دادودہش اور نوازش وکرم میں دربار اودھ ضرب المثل ہوگیا تھا۔ قصیدے کہہ کر شاہی توسل حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہوتا؟

جہاں تک مذہبی قصیدوں کا سوال ہے اسکے لئے تو اودھ کی سرزمین اور بھی زیادہ موزوں تھی۔ قصیدے زیادہ تر مناقب ائمہ اہل بیت میں لکھے جاتے تھے۔ حسن اتفاق کہ یہ دور ہندوستان میں شیعیت کے فروغ کا زریں دور تھا۔ یہاں نہ تو شیعیت پر راسخ اعتقاد رکھنے والے شاعروں کی کمی تھی اور نہ ان کے قدردانوں کی۔ ان حقائق کے باوجود اودھ میں قصیدہ نگاری کو فروغ نہیں ہوا اور دبستان لکھنؤ کے صف اول کے شاعروں نے اس صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ ایک بڑا بنیادی سوال ہے جس کا تسلی بخش جواب ابھی تک نہیں دیا گیا ہے۔ اصل میں لکھنؤ کی اردو شاعری جب اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور ناسخ وآتش کا دور تو وہ انفرادیت پسندی، دبستان سازی، علٰیحدگی پسندی اور شاعرانہ ہنگامہ آرائیوں کا شکار ہوگئی۔ مہاجر زبان دانوں کا خیال لکھنؤ کی زبان کے بارے میں کچھ اچھا نہیں تھا اور اسی طرح لکھنؤ اور دہلی کے شاعروں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوتی جارہی تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:

> ’دلی والے اپنی رفتار اور گفتار پر ناز کرتے تھے اور لکھنؤ والے لکھنؤ کو فخر البلاد سمجھتے تھے اور ہر چیز میں اپنی روش کو دلی والوں سے علٰیحدہ رکھنا چاہتے۔ دہلوی شعراء ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ بلاتکلف اپنے کلام میں لاتے تھے۔ ان کی ضد پر لکھنؤ والوں نے ایسے الفاظ ٹکسال باہر قرار دئے اور اس کا نام اصلاح زبان رکھا۔‘

(لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۷۴)

یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اردو شاعری وہ غزل ہو یا قصیدہ مثنوی ہو یا قطعہ زیادہ تر اظہار فضل و کمال کے مقصد سے وابستہ رہی ہے۔ قصیدے کی ادبی اور فنی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ میں جو چشمک بڑھی وہ غزل کے میدان میں غزل ہی کو سکہ رائج الوقت مانا گیا۔ لکھنؤ والوں نے اپنا ایک ممتاز دبستان شاعری بنانے کے لئے غزل کو آلۂ کار بنایا اور ساری صلاحیتیں اسی کے بنانے اور سنوارنے میں صرف کردیں۔ اصلاح زبان یا نئے دبستان شاعری کا محور غزل ہی قرار پائی۔

ہمارے یہاں بہت کم شاعروں میں ابداع و اختراع کی قوت ملتی ہے۔ ایک مشہور شاعر نے جو روش اختیار کی یا زمین نکالی، اس پر قافلہ چل پڑا۔ اس رواداری میں بہت سے شاعروں کی فطری صلاحیتیں دب کر رہ گئیں۔ ناسخ و آتش نے صرف غزل گوئی کو اظہار فضل و کمال کا ذریعہ اور شاعرانہ فنکاری کا امتحان سمجھا تو سارے لکھنؤ نے ہاں میں ہاں ملائی اور کبھی معاصرانہ چشمک بھی بڑھی تو غزل ہی کے سلسلہ میں۔

ناسخ و آتش کے یہاں اس قسم کے مدحیہ، نعتیہ اور منقبتی شعر ملتے ہیں جو قصیدے کے انداز مداحی سے الگ نہیں اس لئے اس پہلو پر سوچنا ہی غلط ہے کہ وہ مذہبی یا درباری مداحی کے کام کے نہیں تھے۔ لکھنؤ میں قصیدہ نگاری کے فروغ نہ پانے کا ایک سبب یہ ہے کہ غزل گوئی کی گرم بازاری میں قصیدے کی ادبی اور فنی اہمیت کو بھلا دیا گیا۔ قصیدہ شاعرانہ فضل و کمال کے اظہار کا ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے یہ صنف رفتہ رفتہ غائب ہونے لگی۔

شاہ رخ کے زمانے میں ایران میں مدحیہ قصیدے پہلے کے مقابلہ میں بہت کم کہے گئے حالانکہ بظاہر ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ایسا ہی کچھ حال اودھ کے حکمرانوں کا تھا۔ وہ اپنی تعریف نہیں کرانا چاہتے تھے۔ وہ تو شعر وادب کو تفنن طبع کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ جہاں ہر روز روز عید اور ہر شب شب برأت ہو وہاں اس کی ضرورت کہاں کہ اپنی تعریف سنی جائے۔ وہاں ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو اس شراب کو دوآتشہ بنادے اور سرمستی شبانہ روز میں اضافہ کردے۔ شاعروں سے غزلوں کی فرمائش کی جاتی تھی جن پر انہیں صلے ملتے تھے۔ جہاں دربار و ماحول نے غزل کا مطالبہ کیا، وہاں مدحیہ قصیدوں کی ضرورت کیا پڑتی؟

مرثیہ کا فروغ

قصیدے کے رواج نہ پانے کا سب سے بڑا سبب اودھ میں مرثئے کا فروغ ہے۔ مذہبی فرض ادا کرنے کا یہ ایک جامع ذریعہ بھی تھا۔ ساتھ ہی قدرت زبان و بیان کے لحاظ سے اظہار فضل و کمال کے لئے یہ قصیدے کا نعم البدل بھی ثابت ہوا۔ مرثئے میں قصیدے کی روح جاری و ساری ملتی ہے۔ کون سی ایسی خصوصیت ہے جو مرثئے نے قصیدے سے نہیں لی ہے۔ خلیقؔ و ضمیرؔ سے لے کر انیسؔ و دبیرؔ تک کسی مرثیہ گو نے عربی یا فارسی مراثی کو مشعل راہ نہیں بنایا۔ ایسا بھی نہیں کہ دکن اور شمالی ہند کے مراثی کی یہ ترقی یافتہ شکلیں ہوں۔ یہاں قصیدہ مرثیہ کی شکل بنا اور اس کی خصوصیت اس میں جذب کرلی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو سوز و گداز، جو خلوص و سادگی اور جو واقعیت سوداؔ کے مراثی میں ملتی ہے اس کا وجود انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں برائے نام ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں مرثیت کے علاوہ بہت کچھ قابل قدر چیزیں ہیں لیکن جسے مرثیت کہتے ہیں وہ ان کے یہاں خال خال ملتی ہے۔ لکھنؤ کے مراثی کی جڑیں میرؔ کی غزلوں میں نہیں سوداؔ کے قصائد میں ملیں گی۔

یہاں مراثی پر بات کرنے کا موقع نہیں لیکن تھوڑی بہت روشنی ڈالنا اس لئے ضروری ہے کہ قصیدے اور مرثئے کی خصوصیات بیک وقت سامنے آجائیں۔ تشبیب و تمہید کا قصیدے سے خصوصی ربط رہا ہے۔ اس کا فقدان قصیدے میں تشنگی پیدا کردیتا ہے۔ لکھنؤ کے مرثئے اکثر تشبیب و تمہید سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اصل مقصود تک پہنچانے کے لئے تمہید بھی کبھی کبھی اچھا ماحول پیدا کردیتی ہے۔ لیکن اگر دل پر چوٹ لگی ہو اور جذبے میں شدت ہو تو اس کے ایصال و اظہار کے لئے تمہید ایک مضحکہ خیز بات بن جاتی ہے۔ عرب تشبیب کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تھے مگر جب مرثئے کی بات آتی تھی تو وہ تشبیب کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ یہی حال ایران کا تھا۔ تشبیب و تمہید کا انمول خزانہ وہاں جمع کرلیا گیا ہے لیکن جب مرثئے کی بات آتی تھی تو تشبیب و تمہید سے دامن بچالینا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔

قصیدے کی تشبیب کے موضوعات میں بارشکوہ جور آسماں اور فخر تعلّی کو حسن قبول حاصل تھا۔ مرثیوں کی تشبیب کے موضوعات بھی یہی ہیں۔ یہ اپنی جگہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ مرثیوں میں تشبیب نکھر کر آگئی ہے اور شعریت کی بھرپور جھلک اس میں ملتی ہے لیکن کہنا صرف یہ ہے کہ تشبیب کے ضمن میں مرثیہ قصیدے سے متاثر رہا ہے۔

مذہبی قصیدوں میں حسن طلب اور مدعا کا جو حصہ ہوتا ہے، قریب قریب ہر مرثئے میں موجود ہے۔ مضمون آفرینی، نازک خیالی، بلند پروازی، تخیل قصیدے کی لازمی خصوصیات میں شامل کی جاتی ہیں۔ اردو شعر و ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اگر اس کی بہترین مثالوں کی ضرورت ہو تو وہ قصیدے سے زیادہ مرثیوں میں ملیں گی۔

قصیدہ مبالغہ آرائی کی وجہ سے بدنام ہوا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ لکھنؤ کی شاعری کا یہ ممتاز رکن بن گیا۔ ہر صنف سخن میں اس کی حکمرانی ہے۔ مراثی میں اغراق و غلو کی بہتات ہے۔ مرثیہ نگار اس کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھا سکتے لیکن انہیں زور بیان ایسا ہاتھ آیا ہے کہ مبالغہ کی کثافت پر وہ پردہ ڈال دیتے ہیں۔ شوکت الفاظ سے قصیدہ خاص طور پر پہچانا جاتا ہے اور یہ خصوصیت مراثی میں بالخصوص دبیرؔ کے مراثی نمایاں ہے اسی طرح صنائع کے استعمال میں مرثیہ نگار قصیدہ نگاروں سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ مراثی میں کیا اضافے ہوئے اور مجموعی طور پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ قصیدے کا ایک ایک نقش مرثئے پر ثبت ہے۔ اگر یہی مرثئے قصیدے کے عروضی ڈھانچے میں لکھے جاتے تو ہر شعر کھل کر قصیدے کے انداز بیان اور اس کی طرزِ ادا کا ثبوت دیتا لیکن 'مسدس' کی ہیئت نے اس پر بہت کچھ پردہ ڈال دیا ہے۔ مسدس کے ہر بند میں ایک اتار چڑھاؤ کی کیفیت ہوتی ہے اور معنویت کی تکمیل فی الواقع بند کے آخری مصرعوں میں ہوتی ہے۔ یہاں بند کے آخری دو مصرعوں میں زور پیدا کرنے کے لئے چار مصرع تمہید کے طور پر آتے ہیں۔ مصرعوں کی اس اٹھان میں بڑا ترنم پیدا ہو جاتا ہے اور طرزِ ادا قصیدے سے الگ ہونے لگتی ہے۔ مرثئے اور قصیدے میں ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے۔ بحروں کے انتخابات میں دونوں کا الگ الگ راستہ ہے۔ مرثئے کے لئے دو بحریں مخصوص کر لی گئی ہیں۔ ان میں قصیدے بہت کم کہے گئے ہیں۔ اسی طرح قصیدے کی بھی تین چار متداول بحریں ہیں جن میں مراثی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دونوں اصناف میں بحروں کا تفاوت، بند، شعروں اور ترکیبوں کے صوتیاتی انداز میں خلیج حائل کر دیتا ہے اور دونوں کا انداز بیان دو مختلف خانوں میں تقسیم ہونے لگتا ہے۔

یہ تھیں دو بڑی وجہیں دبستان لکھنؤ میں قصیدہ نگاری کے فروغ نہ پانے کی لیکن وہاں اس نے ایک پوری صنف کو جنم دیا اور ساتھ ہی دوسری اصناف کو بھی متاثر کیا۔

درباری اور مذہبی قصیدے

ایک بات اور ہے۔ مذکورہ حقیقت کے باوجود لکھنؤ کے دبستان شاعری میں قصیدہ نگاری کو اچھا خاصا دخل رہا ہے۔ وہ ایک تحریک کی صورت میں نہ سہی۔ درجہ اول کے بعض اور درجہ دوم کے اکثر شاعروں نے قصیدے لکھے ہیں اور یہ قصیدے درباری اور مذہبی دونوں قسم کے ہیں۔ میرؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ کے بعض شاگردوں کے اور سلسلہ شاگردان ناسخ و آتش کے اکثر شاعروں کے قصیدے ملتے ہیں مگر ان قصیدوں کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ نہیں۔ اس دور کے قصیدے اور غزلوں میں کوئی مابہ الامتیاز شئے نہیں۔ سوا اس کے کہ قصیدے میں تشبیب اور گریز وغیرہ کی پابندی ہے۔ زبان اور بیان کے لحاظ سے غزل اور قصیدے کی منزل ایک ہے۔ تشبیب میں وہی رائج مضامین ہیں۔ کبھی کبھی کنگھی چوٹی کا ذکر آ جاتا ہے۔ غزل کی طرح کئی کئی حسن مطلع قصیدے میں کہے جاتے ہیں۔ اس دور کی تشبیب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شکوہ جور فلک اس کے موضوع سے خارج ہو گیا۔ بہاریہ اور طربیہ مضامین غزلیہ انداز میں قلمبند کئے جانے لگے۔ نفرت انگیز اور تمسخر خیز مبالغے استعمال کئے جانے لگے جن میں کوئی رس نہیں، کوئی مزہ نہیں۔ مدح کے باب میں اساتذہ کے رائج کردہ مضامین کے علاوہ ممدوح کا سراپا بھی شامل ہو گیا جس میں ممدوح کو ایک بت طناز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

دبستان لکھنؤ کے بالکل آخری دور میں قصیدہ نگاری ایک تحریک کی صورت میں پروان چڑھنا شروع ہوئی اور بعض شاعروں نے اس صنف میں کافی شہرت حاصل کی۔ اسیر لکھنوی، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوروی اور دوسرے شاعروں نے قصیدہ نگاری میں بڑی کاوش کی۔ اسالیب میں تبدیلی کی اور علمیت و ہمہ دانی کے ایسے نقش و نگار بنائے کہ دبستان لکھنؤ کو اس صنف پر فخر کرنے کا موقع دیا۔ اس دور کے قصیدے اسالیب اجزائے ترکیبی اور زبان و بیان کے لحاظ سے پرانی روش سے الگ ہوتے نظر آتے ہیں۔ تشبیب میں مناظرہ اور قصہ گوئی کو شامل کیا گیا ہے۔ تشبیب و استعارہ اور کنائے کو فروغ ہوا اور مدحیہ مضامین میں تنوع پیدا کیا گیا۔ اگر لکھنؤ میں قصیدہ نگاری کا کوئی دور رہا ہے تو وہ یہی دور ہے۔

❑❑❑

باب دوم

تحقیق و تنقید

پروفیسر محمود الٰہی زخمی کا ادبی و شعری منظر نامہ

پروفیسر انور ظہیر انصاری

C-204، معراج ریزیڈنسی
فتح گنج، بڑودہ (گجرات)
رابطہ: 9898089836

پروفیسر محمود الٰہی کا شمار ان اہلِ قلم اساتذہ میں ہوتا ہے جن کی علمی و فکری بصیرت سے لا تعداد اطلباء و اساتذۂ کرام نے فیض اٹھایا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری بھی ہے۔ اس لحاظ سے انھیں بجا طور پر استاذ الاساتذہ قرار دیا جائے گا۔ ابھی حال ہی میں ڈاکٹر سلیم احمد اور ڈاکٹر قدسیہ بانو نے ان کے گراں قدر افکار کو ۳۶۸ صفحات میں سمیٹ کر کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جن میں ذیلی عنوانات کے تحت مختلف موضوعات پر ان کی نادر و نایاب تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے۔ بابِ اول کو مقدمہ سے متعلق کیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے صحیفۂ محبت کے عنوان سے اول اول شہر گورکھ پور کی علمی و ادبی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور سرسید، شبلی، مہدی افادی ایسے متعدد علمی، ادبی اور سماجی قائدین کی خدمات پر گفتگو کی ہے۔

اس کا دوسرا مضمون ’ خطِ تقدیر‘ سے متعلق ہے۔ ۲۳ صفحات پر مشتمل اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر محمود الٰہی نے اسے نہ صرف مرتب کیا ہے بلکہ اسے اردو کا پہلا ناول بھی قرار دیا ہے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں اس کا جدید ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ یہ یقیناً ان کا اہم کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں تذکرۂ نکات الشعرا کا ذکر بھی آجائے گا جسے اپنے مبسوط مقدمے کا ساتھ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے شائع کیا۔ ’اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ‘ کو اسی زمرے میں رکھ سکتے ہیں جس میں انھوں نے مختلف قصیدوں اور قصیدہ نگاروں کی نگارشات کے مدِّ نظر قصیدہ نگاری کے اہم رجحانات و اسالیب کی روشنی میں اپنے تحقیقی و تنقیدی نتائج پیش کیے ہیں۔ ہاں فسانۂ عجائب کے بنیادی متن سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کو پیشِ نظر ضرور رکھا ہے اور اپنی تحقیقی و تنقیدی بصیرتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ’فسانۂ عجیب‘ اور ’فسانۂ عجائب‘ کے حوالے سے بڑی معنی خیز اور قابلِ ستائش گفتگو کی ہے۔ ’تذکرۂ شورش‘ (رموز الشعرا) پر مضمون جو تقریباً ۳۴ صفحات کو محیط ہے ڈاکٹر محمود الٰہی کے گہرے تنقیدی و تحقیقی شعور کی ایک اور شناخت بن سکتا ہے۔ ۱۱۹۱ھ میں محررہ اس تذکرے پر مختلف زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

اس باب کے آخری پانچ مضامین مولانا آزاد سے متعلق ہیں جن کے ذریعے ڈاکٹر محمود الٰہی نے مولانا صاحب کے فکری ابعاد کو اپنے مفکرانہ حسن کے ذریعے سے اجاگر کیا ہے اور تقریباً ۱۰۰ صفحات میں اپنی بحث کو پھیلا دیا ہے۔ یہ ۱۰۰ صفحات اس لحاظ سے اہم ہوں گے کہ ان کے ذریعے مولانا آزاد کی صحافتی فکر اور اس ضمن میں ان کے نقطۂ نظر پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ پھر مولانا آزاد کا نظریۂ صحافت، الہلال کے منتخب افسانے، غبارِ خاطر سے متعلق گفتگو بھی خاصے کی چیز ہے اور اس سے مولانا آزاد کے نقد و نظر اور محمود الٰہی کی تنقیدی بصیرت پر گہری روشنی بھی پڑتی ہے اور ان کے فکر و خیال کو سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے پروفیسر محمود الٰہی کے تمام گوشۂ ادب کو حتی المقدور سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے حق ادائی بھی کی ہے۔

بابِ سوم میں کل ۲۴ تحریریں ہیں۔ ان میں ادب میں دل بدلی، ادبی سیاست، رانی کیتکی غالب شناسی، مقطع میں آ پڑی ہے وغیرہ قابلِ مطالعہ تحریریں ہیں، جن پر تفصیلی ذکر آئندہ...... سرِ دست میں محمود الٰہی زخمی کی شاعری سے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں، جو بابِ چہارم میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ باب نظموں، غزلوں اور متفرقات کو محیط ہے۔ غزل کی ہیئت میں دس نظمیں ایسی ہیں جن پر عنوان لگایا گیا ہے لیکن ان کے اشعار کے علاحدہ علاحدہ معنی و مفاہیم کے بموجب وہ غزل کا ہی حکم رکھتی ہیں یوں بھی یہ عنوانات شعر کے ٹکڑوں سے ہی لگائے گئے ہیں۔ بعض نظمیں عنوانات سے ہم آہنگ ہیں اور اشعار ایک دوسرے سے مربوط بھی ہیں۔ خصوصاً 'اے وطن کے نوجواں' 'میرا عزم' 'بنکر' اور 'گاندھی جی' ایسی تخلیقات نظمیں ہی قرار دی جائیں گی۔ ان کے علاوہ متفرق اشعار کے عنوان سے جو چھے اشعار ہیں انھیں یک جا کیا ہے ان اشعار سے محمود الٰہی زخمی کے فکری و فنی نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔

شاعر اپنے دل کا بار اور ذہنی غبار شاعری کے توسط سے ہی منظرِ عام پر لاتا ہے۔ محمود الٰہی زخمی کا کلام اس لیے بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ان میں دل میں اٹھتی ہوئی لہریں صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ محمود الٰہی زخمی کی شعری بساط میں مہروں کی جو چالیں ہیں وہ نہ صرف تمام خانوں کو نگاہوں میں رکھ کر چلی گئی ہیں بلکہ تمام مہرے اپنے اپنے مقام پر فِٹ بیٹھتے ہیں یعنی الفاظ کا دروبست شعر کی اندرونی ہیئت کا حصہ بن کر جھول کی بجائے حسن میں ڈھل گیا ہے۔ محمود الٰہی زخمی خدا ترس انسان تھے خوف و ہراس سے بے نیاز اور زمانے کی نیرنگیوں سے نبرد آزما۔ یہی سبب ہے کہ انسان اور انسانوں کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ و تقدس ان کا وتیرہ بن گیا۔ زخمی صاحب کا شعری سرمایہ، جو دستیاب ہے بہت قلیل ہے جیسا کہ سطورِ بالا میں عرض بھی کیا گیا۔ یہ جو بھی سرمایہ دستیاب ہوا ہے وہ مرتبینِ رشحات نے کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ ان میں بیشتر کلام مدینہ بجنور ۱۹۴۳ تا ۱۹۴۷ء کے دورانیہ میں شائع ہوا ہے۔ ایک غزل دبستانِ گورکھ پور میں شائع ہوئی۔ دو نظمیں بنکر اور گاندھی اور چھے متفرق اشعار غیر مطبوعہ والے ہیں۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ زخمی صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہی کیا تھا۔ ان کی شعری اہمیت معاصر شعرا میں اس لیے بھی اہم ہو جاتی ہے انھوں نے اپنی فکر کو کسی ایک حصار میں محصور نہیں رکھا ہے بلکہ زندگی اور زمانے کے امتزاجی مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے اسی لیے تو ان کے یہاں زندگی کے وہ متنوع رنگ منعکس ہوئے ہیں جن پر گردشِ حالات اور معاملاتِ حیات کی مہر ثبت ہے۔

اس سلسلے کی ایک نظم 'محبت کوئی گناہ نہیں' میرے خیال کی تصدیق بن سکتی ہے۔ سات اشعار پر مشتمل اس نظم میں محبت اور اس کے اثرات کو بڑے ہی مؤثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ محبت یا عشق کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ وقت، حالات یا زمانے کی ستم ظریفیوں کے منفی اثرات کس طرح ذہن و دل پر کچوکے لگاتے اور زندگی کی بے بضاعتی کا احساس جگاتے ہیں، سوال یہ ہے۔ دوسرے یہ کہ محبت اگر لامحدود ہے تو ہم اسے محدود کرنے پر آمادہ کیوں ہیں؟ یہ اور اسی نوع کے سوالات محمود الٰہی زخمی نے اٹھائے ہیں اور سماج کو آئینے دکھائے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اپنے فن پاروں کے ذریعے انھوں نے تہذیبی سرفرازی یا تہذیبی انانیت کو نہ زخم آلود ہونے دیا ہے اور نہ داغ دار کیا ہے۔ بلکہ اشعار کی بنت اس انداز سے کی ہے کہ ایک ہی شعر کا مفہوم عشقِ حقیقی سے بھی وابستہ ہو رہا ہے اور عشقِ مجازی سے بھی رشتہ استوار کرتا ہے۔ خصوصاً عشقیہ جذبات سے مملو اشعار میں یہ فکر شدت کے ساتھ ابھری ہے۔ اس غزل کا مطلع اسی فکر کا پرتَو ہے:

ترے کرم کی جو مجھ پر کوئی نگاہ نہیں
تو پھر جہاں میں کہیں بھی مجھے پناہ نہیں

اس شعر میں معنی کی جو تہیں ہیں وہ انھی

جہتوں کی ترجمان ہیں۔

محبت کو ہمارے سماج میں عام طور پر گناہ تصور کیا گیا اسی لیے اس خیال پر ہمیشہ قدغن لگانے کی کوششیں بھی کی گئیں جب کہ مذہبی و تہذیبی اور سماجی و اخلاقی کسی بھی لحاظ سے یہ خیال درست نہیں ہے مانا کہ محبت بہت وسیع تر تصور سے وابستہ ہے اور عشق و عاشقی کے چرچے عشقِ حقیقی و عشقِ مجازی کی صورت میں صدیوں قرنوں سے ہوتے رہے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

تب سے لے کر اب تک عشق کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کیا گیا ہے تو اس کے معنی بالکل واضح ہیں کہ یہ ایک صادق جذبہ ہے جو محمود الٰہی زخمی کے یہاں بھی ابھرا ہے لہٰذا ان کا یہ استدلال بالکل درست ہے:

گلوں میں تاروں میں شمس وقمر میں شبنم میں
کہاں کہاں تری دنیا میں جلوہ گاہ نہیں
تمہاری انجمنِ ناز سے جدا ہوکر
قسم خدا کی کہیں بھی مجھے پناہ نہیں

ان اشعار سے وہ پہلو بھی ابھر آتا ہے جن میں عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی کے پہلو بہ پہلو بلکہ اس سے متصل نظر آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ محمود الٰہی کے شعری و ادبی مطالعات اور ان کی مذہبی فکر کا پرتو ہے کہ ایک ہی شعر سے واضح طور پر دونوں پہلو اجاگر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ حواس کے ذریعے بھی ان کی شاعری کو پرکھنا ہو تو ناامیدی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے شعری تسلسل میں کوئی منفی ارتعاش ابھرتا ہے۔ اگرچہ فکری دائرہ اس حد تک وسیع نہیں ہے لیکن افکار و خیالات کے بے مہابہ اڑان نے ان کی فکر کو مہمیز کیا ہے تو یہ باور کرنا چاہیے کہ زندگی ان کے یہاں متحرک بھی ہے اور رہنما بھی:

میں ان کے حسنِ تخیل پہ لاکھ بار نثار
جو کہہ رہے ہیں محبت کوئی گناہ نہیں
کمی سی دردِ محبت میں ہو چکی ہے مرے
نگاہِ حسن جو پہلی سی اب نگاہ نہیں
جنونِ شوق کی حد سے گزر چکا ہے مگر
یہ بات کیا ہے کہ زخمی ابھی تباہ نہیں

جنونِ شوق تباہی کا پیش خیمہ ہونے کے باوجود اگر زخمی صاحب تباہ نہیں ہوئے تو باور کیا جانا چاہیے کہ شوق ان کی زندگی کا کلید ہے۔ زخمی تخلص ممکن ہے اسی جذبے کا بنیادی سبب بھی ہو، حالانکہ ڈاکٹر سلیم احمد نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ

”چونکہ مجروح سلطان پوری اور ڈاکٹر الٰہی صاحب ٹانڈہ میں ایک ساتھ مدرسہ کنز العلوم میں زیرِ تعلیم تھے۔ لہٰذا مجروح کی ضد میں ڈاکٹر الٰہی نے اپنا تخلص زخمی رکھا اور انقلابی نظمیں لکھنے لگے جو ملک کے مختلف جرائد اور اخبارات میں شائع ہونے لگے، اس میں بجنور سے شائع ہونے والا اخبار مدینہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔“
(رشحات مرتبین ڈاکٹر سلیم احمد، ڈاکٹر قدسیہ بانو)

پوری غزل میں عشق و محبت اور تاثیر و تاثر کا حسن ڈاکٹر الٰہی کے اسی مطمحِ نظر کا اشاریہ ہے۔ تاہم مذکورہ بالا اشعار کے مدِ نظر یہ کہنا شاید غیر مناسب نہیں ہوگا کہ خارجی دنیا سے رشتہ استوار کیے بغیر یہ جذبہ بے دار ہو بھی نہیں سکتا یعنی انجمنِ ناز، نگاہِ حسن اور جنونِ شوق ایسے مرکبات بیک ساعت عشقِ حقیقی و عشقِ مجازی کا احساس بھی رکھتے ہیں اور عام انسانی زندگیوں کی پریشانیوں اور پشیمانیوں پر نگاہ بھی۔ بایں ہمہ یہ جذبہ فکری گہرائی و گیرائی اور وسیع النظری کے بغیر ممکن نہیں، ورنہ وہ یہ شعر:

میں ان کے حسنِ تخیل پہ لاکھ بار نثار
جو کہہ رہے ہیں محبت کوئی گناہ نہیں

کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ بات درست بھی ہے اور اس کج فکری پر تازیانہ بھی جو محبت کو صرف گناہ ہی تصور نہیں کرتے، قرار بھی دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے غور کریں تو محسوس ہوگا کہ ڈاکٹر الٰہی نے اگر اپنا تخلص 'زخمی' اختیار کیا ہے تو باور کیا جانا چاہیے کہ ان کا دل عام لوگوں کے دلوں سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکتا ہے۔

محمود الٰہی زخمی کی شعریات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ ان کا رجحان ترقی پسندی کی طرف بھی رہا ہے۔ نظموں میں تو ترقی پسندی کا حسن ابھرا ہی ہے غزلیہ اشعار میں یہ رنگ اور بھی نکھر آیا ہے۔ یہ زمانہ جہدِ آزادی کے عروج کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں ترقی پسند نظریہ عام طور سے قلم کاروں، فن کاروں اور عوامی خدمت گاروں کے لیے نہ صرف آزادیِ ملک کے ارمان سجانے اور انگریزی سامراج کے خلاف احتجاج و بغاوت کا زمانہ تھا بلکہ قومی جمہوری حکومت کے قیام کی آرزومندی کا بھی زمانہ تھا۔ ظاہر ہے ایسے میں عام انسان تو عام انسان ہمارے قلم کاروں نے بھی انقلاب و بغاوت کے نغمے الاپے، ہاں یہ درست ہے کہ اس الاپ میں بے راہ روی بھی ہوئی اور ادب نعرے بازی تک بھی پہنچا۔ اس عہد کے بیشتر شعرا کے یہاں راج سنگھاسن کے ڈانوا ڈول ہونے کی جانب واضح اشارے اسی آرزومندی

کی علامت ہیں۔زخمی کے یہاں بھی یہ رویہ ابھرا اور انقلاب آفریں پیغام بن گیا لیکن جب صورتِ حال یہ ہوتو کوئی بھلا ضبط بھی کیسے کرے اور کب تک کرے، سو جوش وجذبہ عود کر آیا۔

'اے وطن کے نوجواں' 'صبح نو' 'صبح آزادی' 'جنونِ محبت' 'عزم' 'میرا عزم' 'مجاہد' 'بنکر' 'گاندھی جی' ایسی نظموں اور متفرق اشعار میں جدِ آزادی کا یہ پرتو دیکھا جا سکتا ہے:

قصرِ شاہی پھونک دو پیغام ہے میرے لیے
آج تو بس اذنِ قتلِ عام ہے میرے لیے
جنگِ آزادی، بغاوت، کشت وخون وانقلاب
لحہ بر لحہ نیا ہنگام ہے میرے لیے
راہِ آزادی میں مرنا ہے حیاتِ دائمی
زندگی کا موت بھی پیغام ہے میرے لیے
میں فدائے ساغرِ صہبائے لالہ گوں نہیں
خونِ دشمن کا چھلکتا جام ہے میرے لیے
(مجاہد)

یہ نظم سات اشعار پر مشتمل ہے اور ہر شعر سے ملکی محبت کے شرارے ابھرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ملک اور ملکی آزادی کے لیے مرمٹنے کو حیاتِ دائمی وجاودانی قرار دینا اور ملکی سالمیت اور انسانیت سازی کے جذبے کے فروغ کا ارمان محمود الٰہی زخمی کے سرزمین ہند سے عقیدت ومحبت کا ہی ترجمان ہے۔ہر چند یہ وقتی ابال تھا لیکن جب معاملہ ملکی تحفظ وتوانائی اور حریت وآزادی کا ہو تو نوجوان دلوں کا بے راہرو ہو جانا فطری بات ہے:

اٹھو مزدور و اور امن کے پیغام برو
عصر حاظر کے خداؤں کو کفن پہنادو
(متفرقات)

اسی نوع کی ایک نظم 'میرا عزم' بھی ہے جس میں ترقی پسند نظریہ رقصاں و جولاں ہے۔ساقی نامے کے رنگ میں پندرہ مصرعوں پر مشتمل یہ نظم ڈاکٹر الٰہی کی بہترین نظموں میں شمار کی جائے گی۔اس کی لفظیات سے ہی اس کے انقلابانہ تیور کا اندازہ ہوتا ہے:

ابھی رہنے دے اپنے میکدے میں جام اے ساقی
ابھی سازِ بغاوت پر مجھے کچھ گیت گانا ہے
وطن کے ذرے ذرے کو ابھی باغی بنانا ہے

گزارش

ادبی نشیمن کے قارئین سے گزارش ہے کہ جن ممبران کا زرِ سالانہ ختم ہو گیا ہے وہ میگزین کی ممبرشپ برقرار رکھنے کے لئے زرِ سالانہ رسالہ میں درج پتہ پر منی آرڈر یا براہ راست بینک کھاتے میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

مٹانا ہے ابھی نام ونشاں ظالم حکومت کا
مجھے پیغام دینا ہے ابھی گھر گھر اخوت کا
....
ابھی صیاد سے لینا ہے لڑ کر گلستاں اپنا
ابھی آزاد کرنا ہے مجھے ہندوستاں اپنا
ابھی مت لے خدارا جام وے کا نام اے ساقی
طلب امر یہ ہے کہ ایک ایسا شاعر جسکا مطمحِ نظر مدت سے صلح وامن کا حامل رہا ہوں میں (ع)

رہا ہو، وہ بغاوت کی باتیں کرنے لگتا ہے تو باور کیا جانا چاہیے کہ اس کی روح زخمی اور دل مجروح ہے۔وطن اور وطنیت کا اتنا خوب صورت اور حوصلہ افزا خیال ڈاکٹر الٰہی کی فکری وسعتوں کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ان کی حریت پسندی کی شناخت بھی بن گیا ہے۔اسی ضمن میں نظم 'صبحِ نو' اور 'اے وطن کے نوجواں' کا ذکر بھی آجائے گا کیوں کہ ان نظموں کے ذریعے بھی زخمی صاحب نے نہ صرف ملکی محبت وعظمت کو قوت بخشی ہے اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ ظلم وبربریت اور حق وباطل کے مابین کشاکش کو بے پردہ بھی کیا ہے:

انقلابی گیت گانے کا زمانہ آگیا!
دہر میں ہلچل مچانے کا زمانہ آگیا!
اپنی حد سے بڑھ گئے 'انسان' کے ظلم وستم
خود کو اب باغی بنانے کا زمانہ آگیا
تا بکے باطل سے ڈرنا، تا کجا رنگِ جمود
اب پیامِ حق سنانے کا زمانہ آگیا
مرحبا صد مرحبا اے عندلیبانِ چمن!
اب تمہارے چہچہانے کا زمانہ آگیا

اچھے اشعار پر مشتمل یہ نظم جسے یک موضوعی غزل کہنا میرے خیال میں زیادہ درست ہوگا کیوں کہ چھے اشعار پر مشتمل اس تخلیق میں مطلع بھی ہے اور مقطع بھی۔اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، محسوس ہوتا ہے جیسے زخمی صاحب کو نظم سے زیادہ غزل سے رغبت رہی ہے۔نظم میں بھی غزل کی لفظیات (اردو وفارسی) کا کثرت سے استعمال، قافیہ اور ردیف پر خصوصی توجہ اسی رغبت کی پہچان ہے۔پھر ندائیہ مصرعے، تشبیہات واستعارات اور محاورات وترکیبات کا استعمال بھی زخمی صاحب کی شعری

سمجھ بوجھ کا ثبوت ہیں۔ موضوعی اعتبار سے ملکی سالمیت اور یک جہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، جہدِ آزادی اور آزادی کی خواہش اس نظم کا بنیادی حسن ہے پھر برطانوی حکومت کے مظالم اور ان کے استحصالی رویے بغاوت کا پیش خیمہ بھی بن گئے۔ محمود الٰہی زخمی کو قدرت نے انسانیت کا درد بخشا تھا یہی سبب ہے کہ انسانوں پر بڑھتے ہوئے مظالم کے خلاف اپنی شاعری کو انھوں نے باغیانہ لب ولہجہ دے دیا۔

اے وطن کے نوجواں، اے وطن کے نوجواں
بھول جا یہ سوز و ساز
چھوڑ دے ناز و نیاز
تا کجا گائے گا تو
نغمۂ زلفِ دراز
اے وطن کے نوجواں، اے وطن کے نوجواں

اسی دور میں ایسے شعرا بھی تھے جنھوں نے انقلابی شاعری ضرور کی ہے لیکن ادب و ادبیت بھی ضرور قائم رکھی ہے، ڈاکٹر الٰہی بھی انھی میں سے ایک تھے۔ ان کی نظم 'اے وطن کے نوجواں' ہر چند بغاوتی لب ولہجہ ضرور رکھتی ہے لیکن خودی کو بلند کرنے کا حوصلہ افزا پیغام بھی رکھتی ہے اور قصرِ باطل کو ہلانے اور ہلچل سی مچانے کا جوش بھی پیدا کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ نغمہ ہائے انقلاب کو بربطِ پستی پر گانے کی آرزومندی بھی اس نظم میں ابھر آئی ہے۔ یہ نظم چار بند پر مشتمل ہے اور ہر بند میں چار مصرعوں کے بعد 'اے وطن کے نوجواں' کی تکرار ہوتی ہے۔ ملک کو غلامی سے نجات کی خاطر شاعر کی یہ عقیدت مندی ہے۔ اس کے ارمان، اس کے جذبات کی برانگیختگی ہے اسی لیے وہ ان لوگوں سے نبرد آزما بھی ہے، جو ملک اور ملکی عوام کے ارمانوں پر سیاہ کالے بادلوں کی طرح چھائے ہوئے ہیں اور جن سے نجات کی آرزومندی ملک کے ذرے ذرے سے ہویدا ہے۔ اس نظم پر علامہ اقبال کے نمایاں اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر الٰہی کے جذبات ملکی عقیدت ومحبت کے لیے اگر امڈے آتے ہیں تو باور کیا جانا چاہیے کہ ان کی فکر، ان کا جوش وولولہ اور ان کے جذبات واحساسات ملکی فلاح وخیر کے لیے کیسے کیسے ارمان سجائے بیٹھے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہر گز نہیں کہ زخمی صاحب کو صرف سیاست سے لگاو اور طبقاتی تضاد، مسائلِ حیات اور نیرنگیِ حالات و ماحول سے ہی سروکار ہے۔ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ کوئی بھی شاعر صرف یک رخا نہیں ہوسکتا سو زخمی صاحب بھی نہیں ہیں۔

ان کا دل بھی زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حسن سے مراد کیا ہے؟ زخمی صاحب تو ویسے بھی حسن کے شیدائی تھے۔ خواہ وہ حسن روتے بلکتے بچوں میں ہو، جہدِ آزادی میں ہو، یا وطن اور وطنیت کے رگ وریشے میں ہو، عوامی بے تابی اور سماجی خوش حالی یا پھر سیاسی آزادی میں ہو۔ محنت کش عوام کے بہتے ہوئے پسینے کی بوندوں میں ہو یا تعصب و تنگ نظری کے خلاف آمادۂ پیکار جیالے نوجوانوں کے نعروں میں ہو، زخمی صاحب نے ہر اس مقام پر احتجاج کیا ہے جو انسان اور انسانیت کو تحفظ دے سکے اور جینے کا حوصلہ بخش سکے۔

اس مقام پر ان کے فنی حسن پر گفتگو نہ ہو تو ان کے فکری تموج کا یہ پہلو ذہن ونظر سے اوجھل اور مخفی ہی رہ جائے گا خصوصاً ان کے یہاں مستعمل وہ ترکیبیں اور مرکبات، تشبیہیں اور استعارات، محاورے اور اشارات یا دوسری صنعتیں جو شعر کا حسن بھی ہیں اور شاعر کی جودت کی مظہر بھی اور جو ان کی غزلوں اور نظموں کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے ہم آہنگ کرتی بھی کرتی ہیں۔ کچھ ترکیبیں تو ایسی بھی ہیں جو اختراعی ہیں اور کچھ روایتی ہونے کے باوجود طریقۂ استعمال کی بدولت تازہ کار معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً

یہ انساں کے ظلم و ستم دیکھ کر اب
قیامت اٹھانے کو جی چاہتا ہے
(قیامت اٹھانا)

زخمی میں اپنی شاعریٔ داروگیر سے
دنیا میں اک حشر اٹھا لوں تو چین لوں
(حشر اٹھانا)

میرے ہاتھوں سے تمنائی کا رس چوس لیا
باغ باں بن کے اٹھے اور چمن لوٹ لیا
(لوٹ لینا)

ایسی بہتیری نظیریں ڈاکٹر الٰہی کی تقریباً تمام تخلیقات میں نمایاں نظر آئیں گی۔ ان کے علاوہ وہ ترکیبیں اور مرکبات، تضاد ومترادفات وغیرہ جو زخمی صاحب کی فکری جولانی کے مظہر ہیں، ان کے کلام کا جوہر ہیں:

رنگِ جمود، ظرفِ تشنگی، فدائے ساغرِ صہبائے لالہ گوں، اِذنِ قتلِ عام، عطیۂ پیاشکن، بربطِ جہاد، بربطِ ہستی، ناہیدِ حریت، پرچمِ دغا، نغمۂ زلفِ دراز، نغمہ ہائے انقلاب، سوز وساز، ظرفِ تشنگی، آشنا ناآشنا وغیرہ لیکن ایسی مثالیں دیکھنی ہوں تو ایک بار رشحات پڑھ جائیے یقین جانئے مایوسی نہیں ہوگی۔

□□□

پروفیسر محمود الٰہی کا شعری سروکار

ڈاکٹر غلام حسین

صدر شعبۂ اردو،
گورنمنٹ مادھو پی جی کالج،
اجین، مدھیہ پردیش
رابطہ: 9893853183

ہندستانی تہذیب وتمدن اور ادب وثقافت میں خطہ اودھ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔جس طرح صبح بنارس اور شب مالوہ زبان زد خاص وعام ہے۔اسی طرح شام اودھ کی شہرت بقائے دوام ہے۔اسی علاقے میں واقع کچھوچھہ شریف مرجع خاص وعام ہے۔جسے اردو کی ابتدائی تشکیل وتعمیر میں اولیت واہمیت حاصل ہے۔اردو ادب کے معتبر مورخ حامد حسین قادری کی یہ تحقیق قابل غور ہے:

خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے (جن کا مزار کچھوچھہ شریف علاقہ اودھ میں ہے) اردو میں ایک رسالہ اخلاق وتصوف سنہ 1308 میں تصنیف کیا۔میر نذر علی درد کاکوروی رسالہ نگار لکھنؤ بابت دسمبر 1925 میں لکھتے ہیں کہ سید اشرف جہانگیرؒ نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں 'زبان ہندی' کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے یہ قلمی کتاب دوسو سات صفحے کی ہے۔اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے:

'اے طالب آسماں وزمیں سب خدا میں ہے، ہوا سب میں خدا ہے۔جو حقیقت جان
اگر جان تجھ میں کچھ سمجھ کا مادہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات'

(داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، لکشمی نارائن اگروال تاجر کتب آگرہ، تیسرا ایڈیشن 1966)

اسے نوادر اتفاقات کہیے یا کرشمہ قدرت کہ عہد حاضر کی پانچ ایسی معتبر اور پروقار اردو کی ادبی ہستیاں اسی خاک کا خمیر ہیں۔یہ حلقہ خاص کچھوچھہ شریف سے چند کلومیٹر کے حدود میں محیط ہے۔عہد حاضر میں غزل کی آبرو کہے جانے والے مجروحؔ سلطانپوری گجھڑی قصبے میں پیدا ہوئے۔مایہ ناز محقق پروفیسر محمود الٰہی کی ولادت ٹانڈہ میں ہوئی۔عہد حاضر کے ممتاز شاعر بشیر بدر کے سلف کا تعلق بکیاں سے ہے جو بسکھاری سے محض 6 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔نقیب مشاعرہ اور ادیب ملک زادہ منظور احمد کے آبا واجداد کا تعلق بھدہڑ موضع نزد کچھوچھہ ہے۔ناظم مشاعرہ اور شاعر انور جلال پوری کا بود وباش جلال پور ہے جسے عہد حاضر میں شہر اردو کہا جاتا ہے۔کچھوچھہ شریف سے بھی اس کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔

مجروحؔ او زخمیؔ دونوں الفاظ مترادف ہیں علاوہ ازیں یہ حضرات ہم مکتب اور ہم مشرب ہیں ماقبل آزادی یہاں 'کنزالعلوم' جیسی مایہ ناز دینی درش گاہ کا قیام عمل میں آیا جس سے قرب وجوار کے تشنگان علم فیض یاب ہوئے اسی عظیم ادارہ میں مولانا علیم اللہ صاحب جیسی ذی علم اور برگزیدہ شخصیت شیخ الحدیث تھے۔محمود الٰہی زخمیؔ انہیں کے فرزندار جمند تھے اور شاگرد بھی۔مولانا موصوف مجروحؔ سلطانپوری کے بھی استاد تھے۔اس طرح مجروحؔ و زخمیؔ دونوں حضرات پیر بھائی ہوئے۔مجروحؔ،زخمیؔ سے سینئر تھے اور انہیں میدان شاعری میں بڑی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔قرین قیاس ہے کہ مجروحؔ کی مسحور کن شخصیت زخمی کیلئے تحریک شعری کا باعث ہوئی۔فی الحقیقت بیسوی صدی کے چوتھے دہے میں یہاں شعروشاعری کا بڑا چرچہ تھا۔زخمیؔ کا شاعری کی طرف راغب ہونا اسی ماحول کی دین ہے۔اس خوشگوار ادبی ماحول کے متعلق ندیم انصاری صاحب اس طرح رطب اللسان ہیں:

'اس کنزالعلوم مدرسہ میں تین طلبہ گہرے دوست تھے جس میں مجروحؔ کے علاوہ مہتمم مدرسہ کے صاحب زادے اور ایک انوارالحق تھے۔تینوں میں دوستی کی بنیاد شاعری تھی کیونکہ تینوں کو شاعری سے حددرجہ لگاؤ تھا۔اب جب ان تینوں نے اپنا تخلص رکھا تو اسرالحسن مجروحؔ ہوئے مہتمم کے صاحبزادے محمود الٰہی زخمیؔ ہوئے اور تیسرے انوارالحق فگارؔ ہوئے۔وہ بڑے شاعر نہیں ہوئے مگر مقامی مشاعروں میں حصہ لیتے اور انقلابی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ان تینوں کی تخلیقات روزنامہ 'قومی آواز' لکھنؤ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔مجروحؔ اور زخمیؔ کا لحن بہت اچھا تھا وہ مشاعروں میں ترنم سے پڑھا کرتے تھے اور کامیاب ہوتے۔فگارؔ تحت میں اپنی نظمیں کیفیؔ کے انداز میں پڑھا کرتے تھے۔کچھ عرصے بعد ان تینوں کی تخلیقات ادبی پرچوں میں شائع ہونے لگی۔ان تینوں نے ایک ادبی تنظیم 'نکہت ادبی کلب' کے نام سے بنائی جس کے صدر محمود الٰہی زخمیؔ سیکریٹری اسرار الحسن مجروحؔ اور خزانچی انور الحق فگارؔ تھے۔ان لوگوں کے ساتھ ادب سے دلچسپی رکھنے والے طلباء اور کچھ مقامی شاعر بھی تھے۔اس کی نشستیں عموماً انجمن ترقی اردو ٹانڈہ کے آفس میں ہوا کرتیں یا محلوں میں کسی کے مکان کے چبوترے یا کمرے میں محفل سجائی جاتی۔عوام شوق وذوق سے ان پروگراموں میں شرکت کرتے۔'

(یہ غیر مطبوعہ مضمون ندیم انصاری صاحب جن کا تعلق ٹانڈہ سے ہے اور فی الحال احمد آباد میں مقیم ہیں۔28 فروری 2016 میں مجروع صاحب پر منعقدہ سمینار میں یہ مقالہ پیش کیا تھا)۔

محمود الٰہی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا وہ مشاعروں میں شامل ہوتے تھے اور ان کے ترنم سے سامعین محظوظ ہوتے تھے۔اس سلسلے میں بہت سے شواہد موجود ہیں۔ان کے ایک ہم عمر ساتھی الحاج ارشاد احمد ایڈوکیٹ باشندہ سلطانپور 22 مارچ 2014 کے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' میں سلطان پور میں منعقدہ ایک کانفرنس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

'۱۹۴۶ء ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا جمعیت علماء ہند کانفرنس سلطان پور میں ہوئی تھی جس میں شرکت کیلئے شیخ الاسلام حسین احمد مدنی تشریف لائے ہوئے تھے۔صدارت مولانا نصیر فیض آبادی ایم ایل اے اور نظامت کیلئے اس ناچیز کو منتخب کیا گیا تھا۔ایک شاعر ہماری ہی عمر کا ایک نوجوان زخمیؔ ٹانڈوی کو مدعو کیا گیا تھا وہ لہک لہک کر مترنم آواز میں انقلابی نظمیں پڑھتا تھا یہ کانفرنس تین روز تک مسلسل جاری رہی۔'

پروفیسر مجاور حسین نے اپنے یادگار لمحوں میں گورکھپور میں منعقدہ مشاعرے کی روداد کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

'پورا مشاعرہ جھوم رہا تھا ان کے ترنم میں خمار صاحب کے آہنگ کی جھلک تھی ایک والہانہ کیفیت مسحور کن انداز بقول عمر قریشی مرحوم شاعر شعر میں گم،شعر نغمے میں گم،نغمہ ترنم میں گم اور سامعین فضا میں گم یہ فضا اس وقت بدلی جب لوگوں نے ونس مور کا نعرہ لگایا۔ہم سب لوگوں کو حیرت تھی کہ بھیا نے کہا یار زخمیؔ نے بسمل کر دیا۔'

ماہنامہ نیا دور،لکھنؤ،مارچ ۲۰۱۵ء)

فاخرؔ جلال پوری نے جلال پور میں منعقدہ مشاعرے میں زخمیؔ صاحب کے درج ذیل قطعہ کا ذکر کیا ہے۔

جنگ کی کالی گھٹا کو کفن پہنا دو
زہرآلود فضاؤں کو کفن پہنا دو
اٹھو مزدور اور اے امن کے پیغامبرو
عصر حاضر کے خداؤں کو کفن پہنا دو

آپ کے والد صاحب جب سفر حج کو گئے تو وہ بھی بمبئی تک انہیں چھوڑنے گئے اور وہ وہاں

اس وقت تک مقیم رہے جب تک آپ کے والد وہاں سے واپس نہیں آ گئے۔اس اثناء میں انہوں نے مشق سخن جاری رکھا۔بمبئی سے نکلنے والے اخبارات میں ان کے اشعار شائع ہوتے تھے جسے قارئین بہت پسند کرتے تھے (یہ میں نے ایک گفتگو میں استاد محترم کی زبانی سنا تھا)۔

1986 کے اواخر میں ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں مواد کی فراہمی کیلئے مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جانا پڑا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری میں مطالعہ کے دوران آزادی سے قبل شائع ہونے والے اخبارات کی فائلیں دستیاب ہوئیں جس میں 'ہمدرد'، 'مدینہ' اور 'زمیندار' کی فائلیں دیکھنے کو ملیں۔جس میں آپ کی نظمیں شائع ہوئی تھیں۔میں نے زیادہ تر نظموں کی فوٹو کاپی حاصل کر کے استاد محترم کی خدمت میں پیش کی تھی۔امید ہے ابھی آپ کی ذاتی لائبریری میں وہ فوٹو کاپی موجود ہوں گی۔

غرضیکہ مبدائے فیض میں انہیں موزونیت ودیعت کی تھی۔اس وقت ٹانڈہ میں شعروسخن کا ماحول خوشگوار تھا پہلے تو زخمی صاحب سامعین کی حیثیت سے مشاعروں میں جایا کرتے تھے اور پھر وہ طبع آزمائی کی طرف مائل ہوئے اور ہندی گورکھپوری کے شاگرد بنے۔اس میدان میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور ان کی ریاضت برومند ہوئی۔جب آپ نے شاعری شروع کی تو اس وقت جنگ آزادی پورے شباب پر تھی۔1942 کے ہندستان چھوڑو تحریک سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔اس دور کے ان کے اشعار مشہور زمانہ اخبار مدینہ※(بجنور) میں شائع ہوتے تھے۔اس سے ان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔اس دور کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مرحبا اے ہند تیری تیرابختی جائے ہے
صبح آزادی تجھے اپنی جھلک دکھلائے ہے
اس طرح میں گاتا رہوں نغمہ ہائے انقلاب
آسماں ہے رقص میں تاروں کو وجد آجائے ہے

(مدینہ، بجنور، ۱۳ رمئی ۱۹۴۲ء)

پہلی بار جب ان کی نظم شائع ہوئی تو انہوں نے اپنی دلی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

'جب کہ 14،15 سال کا تھا تو میں نے ایک انقلابی نظم جسے اشاعت کیلئے 'مدینہ' بھیج دیا تھا اور جب وہ شائع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا قد اونچا ہو گیا۔وہ اخبار میں کس کس کے پاس نہیں لے گیا اور ایک صاحب نے مجھ سے اس شعر کا مطلب پوچھا جو 'مدینہ' کی پیشانی پر ہر شمارے پر چھپتا تھا اور جب میں مطلب واضح نہیں کر سکا تو عرق انفعال میں ڈوب گیا لیکن یہ عجز 'مدینہ' سے عشق کم نہیں کر سکا میں نظمیں لکھتا رہا اور مدینہ میں شائع ہوتی رہی۔'

(انتخاب مدینہ، بجنور مرتب عقیل احمد رضوی)

جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی۔اس وقت شعراء کرام انقلابی شاعری کر رہے تھے۔غزل میں مجروح صاحب مینارہ نور بنے ہوئے تھے۔وہ تو ستون دار پے سروں کے چراغ جلانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔زخمی ٹانڈوی بھی اشتراکیت سے متاثر ہو کر باغیانہ لب ولہجہ میں پر جوش اشعار کہنے لگے تھے۔اس وقت ان کے یہ اشعار بہت پسند کئے گئے۔

میں مجاہد ہوں مجھے بستر پہ نیند آتی نہیں
تیغ ہی کی چھاؤں میں آرام ہے میرے لئے
جنگ آزادی بغاوت کست وخون وانقلاب
لمحہ بر لمحہ نیا ہنگام ہے میرے لئے
اپنے نغموں سے ہلا سکتا ہوں ساری کائنات
یہ بھی زخمی کوئی مشکل کام ہے میرے لئے

گاندھی جی کی شہادت پر انہوں نے ایک طویل نظم لکھی جس میں اپنے شدید رنج وغم کا اظہار اس پیرائے میں کیا۔

جو نہ کرنا چاہئے تھا اس نے وہ بھی کر دیا
گولیوں سے سینۂ باپو کو چھلنی کر دیا
شیطنت غش کھا گئی فرعونیت تھرا گئی
ہر خباست الاماں و الامیں چلا اٹھی

وہ سماجی انصاف کے قائل تھے،محنت کشوں اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف پر زور آواز اٹھاتے تھے۔ٹریڈ یونین سے ان کی وابستگی تھی۔اس کے تحت وہ شاعری کرتے تھے۔محنت کش طبقے کی مشقت کی حرمت کا انہیں پاس تھا۔سماج میں بنکروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور ان کی خستہ حالی کو شاعری کا موضوع بنایا۔اس پر انہوں نے بڑی معرکتہ الآرا نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔اس میں سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

میرا یہ ہاتھ کہ جس سے تمہیں خط لکھتا ہوں
چلے کھرگھے پہ تو اس ید بیضا کہیے
مصر پہنچے تو یہی دامن یوسف ہو کر
دست بازو زلیخا کی تمنا بن جائے
گیرواچیر بنے بن میں یہ سیتا جی کا
نجد پہنچے تو نقاب رخ لیلہ بن جائے

مگر جب استحصالی قوتوں نے اس صنعت کو تباہ وبرباد کر دیا تو وہی ہنرمند طبقہ خستہ حال اور مفلوک الحال ہو گیا۔اس کا انہیں شدید

احساس تھا چنانچہ اس کرب کو اشعار کی شکل میں اس طرح ڈھالا ہے۔ ۔ ۔

میرے ہاتھوں سے تمنائی کا رس چوس لیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن لوٹ لیا
آ رہتی جو میری تخلیق کا سودائی تھا
ایک بے جان سی تصویر نظر آتا ہے
چوٹ تو مجھ پر پڑی درد اٹھا کس کس کے
جس کو دیکھو وہی دل گیر نظر آتا ہے

پروفیسر صاحب نے اقتضائے وقت کے تحت خوب سے خوب تر انداز میں شاعری کی اور مقبولیت کے بام عروج پر پہنچے۔ اور جب انہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو اصناف شاعری کو ہی اپنے مقالے کا موضوع قصیدہ جیسی پر شکوہ صنف کو بنایا۔ آپ کے مقالے کا موضوع تھا 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' اس مقالہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اعلیٰ تعلیم میں اساتذہ اور طلباء کیلئے اس اہم اور معلوماتی کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسے ارباب ادب نے نظر استحسان سے دیکھا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے اسے علم افروز اور چونکا دینے والی اطلاعات سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل بسیط اور منضبط مقالہ ہے۔ بیشک اس صنف کو ام الاصناف کہا گیا ہے۔ اس صنف کے متعلق مقالہ نگار کا عالمانہ اظہار خیال ملاحظہ کیجئے:

'اصل میں قصیدہ ایک انداز بیان اور پاک طرز ادا کا نام ہے جو فارسی کے براہ راست اثرات سے اردو میں پروان چڑھا اور جوں جوں فارسی کا اثر کم ہوتا گیا یہ انداز بیان زوال پذیر ہوتا گیا۔ قصیدے نے اردو غزل کو جلوہ صد رنگ کے انداز بخشے اور مرثیہ کو ایک لیول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا رنگ سکھایا'

(اردو میں قصیدہ نگاری کا جائزہ ص نمبر ۱۱)

عروض وہ علم ہے جس کے ذریعہ اشعار کے اوزان کو جانچا جاتا ہے اس سے ہمیں شعر کے موزوں اور ناموزوں ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس علم کے شعور و آگہی کے بغیر نا تو معیاری شاعری کی جا سکتی ہے اور نہ ہی شعر خوانی کا سلیقہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اردو شاعری کے عہد زریں میں تو علم عروض کی واقفیت شعری فوقیت کی ضمانت تھی۔ عربی قصیدے کے عروضی تراکیب و بیان و بدیع سے متعلق پروفیسر محمود الٰہی تحریر فرماتے ہیں:

'عربی قصیدہ میں ایک شعر کو لفظی اور معنوی حیثیت سے پرکھنے کیلئے معنی اور بیان بدیع و عروض کے سیکڑوں اصول وضع کئے گئے ہیں جو عرب کے مزاج میں صدیوں سے رچا بسا تھا'

(ردو میں قصیدہ نگاری کا جائزہ ص نمبر ۴۸)

اردو ادب میں حروف تہجی سے لے کر تمام ادبی سرمایہ پر عربی و فارسی کے نقوش مرتسم ہیں۔ اردو اور عربی کے مستحکم رشتے کے مد نظر آپ کا یہ لسانی درک سے معمور قول دیکھئے:

'ماہرین لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ عربی اور اردو زبانیں دو مختلف خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں اس کے باوجود اردو زبان کے شعر و ادب کا سلسلہ کسی نہ کسی انداز میں جزوی یا کلی طور پر عربی ادب سے مل جاتا ہے یہ ربط صورت میں بھی اور معنی میں بھی۔'

(اردو میں قصیدہ نگاری کا جائزہ ص نمبر 27)

صنف قصیدہ کی ادبی اہمیت اور افادیت سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اس صنف کی قدر و قیمت اور ادبی تفہیمات پر یہ خلاصہ کلام معنی خیز ہے:

'قصیدہ ہماری ادبیات کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ماضی کے ورثہ کا بڑا جاندار حصہ اور اپنی ادبی لسان و شکوہ انداز بیان کی آراستگی تخیل کی لالہ کاری اور اپنے عہد کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی کامیاب عکاشی کی بنا پر اردو قصیدوں کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔'

(اردو میں قصیدہ نگاری کا جائزہ ص نمبر 478)

شعراء اردو کے تذکرے شعری و ادبی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ تذکروں پر آپ کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے دو اہم تذکرے مرتب کئے ہیں۔ نکات الشعراء کی اشاعت 1972 میں ہوئی جس کے مقدمے میں انہوں نے اس تذکرے کے محاسن کو اس طرح بیان کیا ہے:

'اس کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ ہمارے ایک ایسے شاعر کی رشحات قلم ہے جس نے غزل کی تقدیر بدل دی ایسے شاعر کا ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک حرف ہمارے کام آ سکتا ہے اور پھر نکات الشعراء میں تو میر کی شخصیت بھرپور طریقے سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے مطالعے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ یہ

دراصل دوسرے شاعروں کا تذکرہ کم اور میرؔ کا اپنا تذکرہ زیادہ تھے۔'

(نکات الشعراء، مرتب پروفیسر محمود الٰہی ص ۱۰)

قدیم تذکروں میں تذکرہ سورش (رموز الشعراء) کا شمار ہوتا ہے۔اس قدیم نسخے کو خانقاہ رسیدیہ جونپور سے حاصل کرکے 1984 میں شائع کیا۔

موصوف نے اردو اکیڈمی اتر پردیش سے شائع ہونے والے شاعروں کے انتخابات اور دیگر شعراء کرام کے مجموعہ کلام پر جو عالمانہ اور فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے وہ شعری تنقید کے سہ پارے ہیں۔ڈاکٹر سیدہ جعفر نے جب قلی قطب شاہ کے کلام کا انتخاب پیش کیا تو پروفیسر صاحب نے جو پرمغز پیش لفظ لکھا۔اس کا یہ اقتباس قابل ذکر ہے:

'محمد قلی قطب شاہ کو ایک طور پر اردو شاعری کا معمار اول کہا جا سکتا ہے۔اس نے اردو شاعری کو ان قدروں سے معمور کیا جو ہندستان کے گرد وپیش کے زائدہ اور پروردہ تھیں۔شاعری میں جن موضوعات کی اہمیت موجودہ صدی میں محسوس کی گئی محمد قلی قطب شاہ انہیں بڑی کامیابی کے ساتھ برت چکا تھا۔اس کا کلام فطری شاعری کا قابل رقص نمونہ ہے یہ کہنا غلط نہیں کہ اس کی شاعری کو مشعل راہ بنایا جاتا تو اردو شاعری بہت سے الزامات سے محفوظ رہتی۔'

پروفیسر محمود الٰہی بحر شعر وادب کے شناور و دانشور تھے۔ادب کی تاریخ اور تحریک پر ان کی گہری نظر تھی۔شعری اصناف سے انہیں گہرا شغف تھا اور فن کے رموز نکات میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔بحث و مباحث میں شرکاء ان کی معلومات کے معترف ہوجاتے اور ادبی چشمک کے مخالف پنبہ دہاں ہوجاتے۔رباعی کے متعلق جید عالم مجنوں گورکھپوری سے گرما گرم بحث چھڑ گئی تو لوگوں کو ان کی علمی استعداد کا اندازہ ہو ایک صاحب علم نے یہ واقعہ یوں بیان کیا ہے:

'غالباً 1961-62 کی بات ہے ہماری زبان میں علامہ اقبال کی رباعیوں پر بحث شروع ہوگئی اسلوب احمد انصاری اور

> پروفیسر صاحب نے اقتضائے وقت کے تحت خوب سے خوب تر انداز میں شاعری کی اور مقبولیت کے بام عروج پر پہنچے۔اور جب انہوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں قدم رکھا تو اصناف شاعری کو ہی اپنے مقالے کا موضوع قصیدہ جیسی پرشکوہ صنف کو بنایا۔آپ کے مقالے کا موضوع تھا 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' اس مقالہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اعلیٰ تعلیم میں اساتذہ اور طلباء کیلئے اس اہم اور معلوماتی کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اسے ارباب ادب نے نظر استحسان سے دیکھا ہے۔پروفیسر گیان چند جین نے اسے علم افروز اور چونکا دینے والی اطلاعات سے تعبیر کیا ہے۔

مجنوں گورکھپوری میدان میں مسلح ہوکر اترے تھے مجنوں صاحب کے جواب میں محمود الٰہی کمر بستہ ہوئے۔گرمیوں کی پوری تعطیل لکھنؤ اور علی گڑھ کے کتب خانوں میں گزار کر جوابی مضمون قلم بند کیا۔مضمون شائع ہونا تھا کہ مجنوں گورکھپوری چراغ پا ہو گئے اور جواب میں نازیبا باتیں بھی لکھ گئے جس کا جواب قاضی عدیل عباسی مرحوم نے دیا جس کا عنوان تھا 'اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت' غرض اس علمی بحث میں محمود الٰہی صاحب کی علمی استعداد اور شرافت کا اعتراف کیا گیا۔'

(خبرداد جدید، دہلی یک تا 15 جولائی 2010 ص نمبر 15)

غرضیکہ زخمیؔ صاحب کی شعری کاوش سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ملک زادہ منظور احمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ اگر انہوں نے شاعری ترک نہ کی ہوتی تو ایک بے مثال شاعر بھی ہوتے۔یہ بات سچ ہے کہ ان کی طبیعت میں موزونیت بدرجہ اتم تھی۔وہ شاعری کے مالہ و ماعلیہ سے بخوبی واقف تھے۔ان کی تدریس وتحریر میں شعری محاسن کی کارفرمائی تھی۔وہ جب شعر کی بلند خوانی کرتے تو اس میں جان سی پڑ جاتی۔اشعار کے افہام وتفہیم میں وہ فن کے رموز ونکات کو آئینہ کردیتے۔

وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ان کی نثری تحاریر شاعری کی جلوہ گری سے مزین اور شعری اوصاف سے متصف ہے۔وہ شعری وسائل سے جملے کی تہذیب وترتیب کہیں اور بڑی چابک دستی سے اسے خاتم میں نگیں کی طرح جڑتے ہیں۔ان کی ایسی تحریریں اردو ادب کیلئے سرمایہ افتخار ہیں، بھلے ہی وہ تحقیق کے مرد میداں تھے اور انہوں نے شاعری ترک کردی تھی۔پھر بھی اہل علم وادب نے انہیں پروفیسر محمود الٰہی کے ساتھ ساتھ محمود الٰہی زخمیؔ کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

□□□

پروفیسر محمود الٰہی بحیثیت محقق

ڈاکٹر مجاہد الاسلام

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،
لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ
رابطہ: 9628845713

قبل اس کے کہ ہم اپنے اصل موضوع پر آئیں ہمارے لئے سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ آخر ریسرچ یا تحقیق ہے کیا۔ اس ذیل میں مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین اپنی مشہور زمانہ تصنیف 'تحقیق کا فن' میں رقمطراز ہیں:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے 'نامعلوم یا کم معلوم کو جاننا' یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں انہیں کھوجنا، جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں ان کی دھند دور کر کے انہیں آئینہ کر دینا۔ انسان کو ہمیشہ نامعلوم کو جاننے کی کد رہتی ہے۔ معلوم کرنے میں دوسرے فوائد سے قطع نظر ایک ذہنی حظ اور طمانیت حاصل ہوتی ہے''۔

(تحقیق کا فن: ڈاکٹر گیان چند۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سن 2013۔ ص 13)

یہ تو رہی تحقیق سے متعلق ایک عام سی بات۔ جہاں تک رہا ادبی تحقیق کا مطالبہ و مقصود تو اس ذیل میں رشید حسن خان کا خیال ہے:

''حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج ادبی تحقیق کا مقصود ہے یا ہونا چاہیے۔''

(ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خان لکھنؤ 1990 ص 121)

ادبی تحقیق کے بہت سارے اصول و ضوابط ہیں جن کو اپنی تحقیق کے دوران ایک محقق کو پیش نظر رکھنے ہوتے ہیں۔ یہاں پر ان سب کا ذکر نہ کر کے بابائے تحقیق قاضی عبدالودود کے سلسلے میں مالک رام کی رائے کو نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بقول مالک رام:

''قاضی صاحب کی اردو تحقیق کو سب سے بڑی دین یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ پوری طرح مدلل اور درست ہو۔ قانون شہادت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب تک کسی شخص کا قصور ثابت نہ ہو جائے وہ بے قصور اور بے گناہ ہے۔ قاضی صاحب کا اصول اس کے بالکل برعکس ہے، یعنی وہ اس بنیاد سے

شروع کرتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو بے قصور اور بے گناہ ثابت نہیں کرتا وہ قصوروار اور مجرم ہے۔ آپ کہیں گے یہ بہت سخت اصول ہے، بے شک ایسا ہی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ یہی ان کا نظریہ ہے اور اسی پر انہوں نے عمر بھر عمل کیا''۔ (قاضی عبدالودود: تحقیقی و تنقیدی جائزے۔ مرتبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غالب انسٹی ٹیوٹ۔ نئی دہلی۔ سن 1991۔ ص256)

رشید حسن خاں کا تحقیق کے سلسلے میں یہ بھی خیال ہے:

''تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا، کیوں کہ ذرائع معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ حجابات بالتدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس سے نئی معلومات کے امکانات کی نفی نہیں ہوسکتی لیکن یہ بات بھی اسی قدر وضاحت سے سمجھ لینا چاہیے کہ محض آئندہ کے امکانات کی بنا پر ان باتوں کو بطور واقعہ نہیں مانا جاسکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔''

(ص14، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ: رشید حسن خاں لکھنؤ 2005)

پھر ہم جب یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ آخر کون سی ایسی چیز ہے جو ایک محقق کو اس کے تکمیل مقصد کی راہ میں سب سے زیادہ مانع ثابت ہوتی ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مبالغہ، آرائشی زبان و انشاء پردازی اس کے لئے سم قاتل ہیں۔ اس ذیل میں قاضی عبدالودود اپنے مضمون 'اصول تحقیق' میں لکھتے ہیں:

''محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لئے کرنا چاہیے۔ آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔ اسماء کے ساتھ صفت اسی وقت لانا چاہیے جب کوئی صفت لکھنے والے کی اصل رائے ظاہر کرتی ہو''۔

(قاضی عبدالودود: تحقیقی و تنقیدی جائزے۔ مرتبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غالب انسٹی ٹیوٹ۔ نئی دہلی۔ سن 1991 ص174)

رشید حسن خان بھی ایک محقق کو سب سے پہلے اس طرح کی آرائشی زبان سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، چنانچہ وہ محولہ بالا مضمون ہی میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش و مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط برتنا چاہیے، اردو تنقید جس طرح انشاء پردازی کا آرائش کدہ بن کر رہ گئی ہے وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننا چاہیے۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خان لکھنؤ 1990 ص19)

اسی ذیل میں کلیم الدین احمد 'آب حیات' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر آزاد اس عبارت آرائی سے کنارہ کشی کرتے اگر وہ صاف اور سادہ لفظوں میں ہر دور کی سیاسی، معاشرتی اور عقبی زمین پیش کرتے اور بدلتے ہوئے منظر کی ٹھوس لفظوں میں تصویر کھینچتے تو آب حیات کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی۔ باقی تمہیدوں کا بھی یہی حال ہے، کام کی باتیں کم اور لفاظی زیادہ ہے، اس لیے مختلف دوروں کی خصوصیتیں اور ان دوروں کو قائم کرنے کی دلیلیں صاف اور قابل قبول نہیں ہوتیں یعنی ادب کی تاریخ کی حیثیت سے آب حیات کامیاب نہیں ہوتی۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، پٹنہ، 1983 ص54)

جہاں تک رہا پروفیسر محمود الٰہی کی ادبی خدمات کا سوال تو آپ تحقیق و تنقید کے میدان میں یکساں مہارت رکھتے ہیں جہاں تک رہی تحقیق کی بات تو ان کے مضامین 'اردو میں جدید تحقیق کا آغاز (سرسید اور ان کے بعض رفقا)'' ناسخ کا دیوان دوم'' مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم اخبار'' اردو میں عربی شعراء کا پہلا تذکرہ' شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک اور نثری کارنامہ'' غالب کا سفر کلکتہ (ایک غلط فہمی کا ازالہ)'' کربل کتھا'' اردو تحقیق کے میدان میں ان کو وقار بخشنے میں کلید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہیں اردو تنقید میں ان کے مضامین ''اردو ڈرامہ اور انارکلی' لکھنؤ اسکول اور اردو قصیدہ نگاری' 'احتشام حسین بحیثیت نقاد' خطوط غالب میں زبان وادب کے مسائل' وغیرہ ان کی اردو تنقید میں ایک الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔

رہی تحقیق کی بات تو اس میدان میں محمود الٰہی کا وہی طریقہ کار رہا ہے جو اس میدان کی اہم شخصیات محمود خان شیرانی، قاضی عبدالودود عبد الستار صدیقی اور رشید حسن خان وغیرہ کا رہا ہے۔

محمود الٰہی کی تحقیق ہو یا تنقید ایک چیز جو اس میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ یہ کہ ہر جگہ ان کا دوٹوک اور واضح موقف ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں بلا کسی لاگ و لپیٹ کے دو دو چار کے انداز میں کہہ دیتے ہیں، یہ چیز ان کی ہر تحریر سے مترشح ہے۔ سر سید احمد خان کو اردو تحقیق و تدوین میں بنیاد گزار کی حیثیت حاصل ہے ان کی اس خوبی کا اندازہ خود ان کی مرتب کردہ کتاب 'آئین اکبری'، 'تاریخ فیروز شاہی'، 'اور تزک جہانگیری' اور آخر میں ان کی تصنیف کردہ کتاب 'آثار الصنادید' سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ 'آثار الصنادید' کے پہلے اڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''اس کے پہلے اڈیشن نے اردو تحقیق کو ایک نیا موضوع دیا، مگر اس میں نئے آداب تحقیق کے واضح نشانات نہیں ملتے ہیں۔ اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سر سید نے اس تصنیف کے پیچھے کتنے ہفت خواں طے کئے ہونگے اور کتنا خون جگر صرف کیا ہوگا، مگر حق بات یہ کہ وہ تحقیق جدید کے مبادیات تک نہیں پہنچ سکے، اس میں نہ تو روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کا رجحان ملتا ہے اور نہ استدلالی طریقہ کار اپنانے کا میلان پایا جاتا ہے، یہ اڈیشن ماخذ کے حوالے اور ان کی ثقاہت کی چھان بین سے بھی خالی ہے''۔

(باز یافت: پروفیسر محمود الٰہی: ترتیب: ڈاکٹر زیبا محمود۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سن 2014 ص 27)

آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سر سید احمد خان پر محمود الٰہی کی رائے کتنی زیادہ واضح اور دوٹوک ہے جب کہ اس میدان کے اکثر ماہرین کے قدم سر سید خان پر رائے زنی سے قبل ہی ڈگمگا جاتے ہیں۔

اس طرح وہ اپنے مضمون 'طبقات الشعرائے ہند' پر کریم الدین کی گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کریم الدین اس تذکرے میں اور بھی زیادہ سہو کا شکار اس لئے ہوئے کہ انہوں نے پورے کا پورا دتاسی کو نقل کرنے کوشش کی ہے اگر وہ آزادانہ طور پر اپنی صلاحیت اور ذہنی اپج کا استعمال کرتے تو اس صورت میں تذکرے کی وہ حالت نہیں ہوتی جو اب ہے۔ محمود الٰہی کے ہی لفظوں میں:

''کریم الدین دتاسی کی تاریخ کا اعتراف اس سے زیادہ کیا کرتے اس کے اس اعتراف کے نمونے طبقات میں جگہ جگہ ملتے ہیں، ماخذ کو کھنگالنے اور مطالب کے اخذ و ترک میں تاسی سے بے پناہ غلطیاں ہوئیں۔ کریم الدین نے اس حسن ظن اور اس خوش فہمی کی بنا پر کہ دتاسی نے تذکرہ بہت اچھی طرح تالیف کیا تھا، تاسی کے ماخذ تک براہ راست پہنچنے کے بجائے کہیں اس کے بیانات کا ترجمہ اور کہیں اس کا نفس مضمون طبقات میں شامل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لغزشوں اور کوتاہیوں میں وہ تاسی کے شریک و سہیم بن گئے۔ کریم الدین کی سب سے بڑی خامی یہ کہ جن ماخذ سے وہ تاسی سے کہیں اچھے طور پر استفادہ کر سکتے تھے، انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ یہی وہ جگہ جہاں ان کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت مفلوج اور معطل ہو کر رہ گئی ہے''۔

(ایضاً 57)

اسی طرح محمود الٰہی کریم الدین کے ایک دوسرے تذکرہ ''اردو میں عربی شعراء کا پہلا تذکرہ'' کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس تذکرے کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں کریم الدین مصنف کے حالات و واقعات لکھنے میں کئی کئی ماخذوں کی نشاندہی تو ضرور کرتے ہیں مگر واقعات کی صحت پر اتنی زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں جس کا کہ حقیقی معنی میں وہ واقعہ تقاضا کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کریم الدین نے اس تذکرے کی بنیاد عربی تذکروں پر رکھی ہے وہ اکثر اپنے ماخذ کا حوالہ دیتے ہیں جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ وہ کسی شاعر کے ترجمے کے سلسلے میں انھیں ماخذ کو زیادہ مستند قرار دیتے ہیں جن میں اس کے حالات زندگی مجمل مگر جامع طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ رہتا ہے کہ شعراء کے حالات ضرور لکھے جائیں۔ اس مقصد کے لئے انہیں اکثر چار چار اور چھ چھ تذکروں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ ماخذ کی فراہمی کوئی مشکل کام نہیں لیکن اخذ و ترک کے باب میں صحت مند نقطہ نظر اور اصابت رائے بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے، کریم الدین کو اس منزل پر مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماخذ پر اعتماد کرتے ہیں اور انھیں کی مدد سے ہر شاعر کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ جس تذکرہ نگار سے وہ اپنے کام کی چیز اخذ کر رہے ہیں، وہ ثقہ ہے یا نہیں۔ اصل میں تحقیق کی منزل کے راہی ہیں لیکن اس کے خارزار سے الجھنا نہیں چاہتے ہیں اور ایسا صرف اس لئے ہے کہ ان

کے تنقیدی شعور میں پختگی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی اپنے ماٰخذ کی سخت گرفت کرتے ہیں۔حماد الروبہ عربی کا اچھا شاعر ہے اور روایت شعر میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔کریم الدین نے اس کے حالات میں اس کا اور ہشام کا ایک مشہور قصہ بھی نقل کیا ہے۔قصہ کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ حماد کے چند شعر سن کر ہشام محظوظ ہوا اور اس نے لونڈی سے شراب پلانے کی فرمائش کی۔کریم الدین اس واقعہ کو سچ نہیں مانتے۔وہ کہتے ہیں:''یہ خبر صحیح نہیں ہے کیونکہ ہشام شراب نہیں پیتا تھا اس لئے اس قصے کا ذکر کچھ ضرور نہیں''۔

(ایضاً ص۹۶)

اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ اصل میں ناسخ کے تین دیوان ہیں جن میں دو ہی مشہور ہوئے۔آزاد کے اس قول کو بنیاد بنا کر کئی لوگ تسامح شکار ہوئے۔اس پر سے پردہ اٹھایا محمود الٰہی نے مرزا عسکری اور مسعود حسین رضوی کی باتوں کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ناسخ کا پہلا دیوان متن میں ہے اور پہلا اور دوسرا حاشیے میں اس طرح سے ان کا دوسرا اور تیسرا دیوان الگ سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا ہے۔محمود الٰہی اپنے مضمون 'ناسخ کا دیوان دوم' میں رقمطراز ہیں:

''ناسخ کے باب میں محمد حسین آزاد کا یہ قول کہ ان کے دیوان تین ہیں مگر دو مشہور ہوئے ایک عرصے تک بعض ادبی حلقوں میں غلط فہمی پھیلاتا رہا اور لوگ یہ سمجھتے رہے کہ ان کا تیسرا دیوان پردۂ خفا میں ہے۔اس غلط فہمی کو غالباً پہلی بار 'ہسٹری آف اردو لٹریچر۔رام بابو سکسینہ' کے مترجم مرزا عسکری نے کلیات ناسخ مطبوعہ ۱۲۶۲ھ کا حوالہ دے کر دور کرنے کی کوشش کی۔اس کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس موضوع پر مختصر مگر مدلل مضمون لکھا اور اردو دنیا کو کلیات ناسخ کی پہلی دو اشاعتوں کے خاتمۂ عبارت کی طرف متوجہ کیا جس میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ پہلا دیوان متن میں اور دوسرا اور تیسرا دیوان حاشیے پر ہے۔خاتمہ عبارت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تیسرا دیوان اپنی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ دوسرے دیوان کی ہر ردیف کے ضمیمے کے طور پر تیسرے دیوان کے اشعار شامل ہیں سچی بات تو یہ کہ اس غلط فہمی کی ابتدا مولوی کریم الدین کے اس قول سے ہوئی جس کی ترجمانی محمد حسین آزاد نے کی:اس نے تین دیوان تصنیف کئے ہیں۔۔۔۔۔میں نے بھی ان کے تینوں دیوان دیکھے ہیں۔اب ۱۸۴۶ء میں چھپ کر تیار ہو گئے اور تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے ہیں۔اگرچہ آب حیات کی تصنیف سے بہت پہلے کلیات ناسخ شائع ہو چکا تھا مگر آزاد نے نہ تو اس کے خاتمۂ عبارت کو دیکھا اور نہ غالباً اس امر پر اپنے معاصرین سے استصواب کیا۔اگر آزاد اپنے قول کی تحقیق کر لیتے تو یہ ٹیڑھی دیوار جس کی تعمیر میں ان کے خوشہ چین ناقدین اور محققین کا خون جگر صرف ہوا ہے نظر نہ آتی حیرت اس بات پر ہے کہ مرزا عسکری اور پروفیسر رضوی کی وضاحت کے باوجود لوگ آزاد کے قول پر اعتماد کر کے ان کے تیسرے دیوان کو کوئی پراسرار شے سمجھتے ہیں''۔

(ایضاً 101)

غالبؔ کے سفر کلکتہ کے بارے میں ایک خیال عام ہے کہ غالبؔ جب ایک مرتبہ نواب احمد خاں بنگش کی معیت میں دہلی سے بھرت پور کے لئے روانہ ہوئے تو پھر وہ وہیں سے فیروز پور،لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچ گئے اور یہی مالک رام کا بھی خیال ہے مگر بعد میں مالک رام کے اس خیال میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے پھر ایک نول کشوری نسخے کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ چونکہ غالبؔ سفر پر جانے سے پہلے مولوی فضل خیر آبادی سے نہیں ملے تھے اس لئے وہ پہلے بھرت پور سے دہلی واپس آئے اور پھر مولانا سے ملاقات کر کے کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔پروفیسر محمود الٰہی کا کہنا ہے کہ وہی نول کشوری نسخہ میرے پاس بھی ہے مگر اس میں اس طرح کی بات مرقوم نہیں ہے۔ممکن ہے مالک رام کے پاس کوئی اور نسخہ رہا ہو۔اگر ایسا ہے تو وہ آخر اس نسخے کا حوالہ کیوں نہیں دیتے ہیں۔محمود الٰہی اپنے مضمون 'غالبؔ کا سفر کلکتہ (ایک غلط فہمی کا ازالہ)' میں رقمطراز ہیں:

''ان کی درخواست سے واضح ہوتا ہے کہ جب ۱۸۲۵ء میں وہ نواب احمد بخش کی معیت میں بھرت پور کے لئے روانہ ہوئے تو پھر دہلی واپس نہیں لوٹے بلکہ فیروز پور،لکھنؤ وغیرہ میں قیام کرتے ہوئے سیدھے کلکتہ پہنچ گئے۔غالب کلکتہ سے ۱۸۲۹ء میں دہلی واپس پہنچے۔درخواست کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ جناب مالک رام بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ غالب ایک مرتبہ جو دہلی سے نکلے تو پھر فیروز پور،کانپور،لکھنؤ اور

باندہ میں کوئی سال بھر قیام کرنے کے بعد سیدھے کلکتہ پہنچ گئے۔لیکن وہ اس نتیجے سے مطمئن نہیں ہوئے،انہوں نے مزید تحقیق کی اور اردو دنیا کو مطلع کیا کہ ''کلیات غالب(۶۵-۶۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل خیرآبادی سے وداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے۔اس لئے ان سے ملنے کو دہلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔کلیات کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔درخواست میں انہوں نے اختصار سے کام لیا اور اس کا ذکر مناسب (ضروری) خیال نہیں کیا۔''

(ذکر غالب ص ۶۹ نیز افکار،کراچی،غالب نمبر ص ۵۱)

اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں:

'مندرجہ بالا اقتباس کا یہ جملہ بطور خاص اہم ہے کہ چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل خیرآبادی سے وداعی ملاقات نہیں کر پائے تھے اس لئے ان سے ملنے کو دہلی واپس گئے۔گویا جناب مالک رام نے صرف یہی نہیں ثابت کیا کہ وہ کلکتہ والے سفر کے ضمن میں فیروزپور سے دہلی واپس آئے۔بلکہ اس کا ایک سبب بھی ثابت کردیا۔۔۔۔۔۔ذکر غالب میں کتابیات کے ذیل میں کلیات نثر غالب فارسی نول کشور پریس کانپور،۱۸۷۵ کا ذکر ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جناب مالک رام نے اسی کتاب کے حوالے پیش کئے ہیں۔اگرچہ میرے پیش نظر بھی یہی نول کشوری نسخہ ہے لیکن حیران ہوں کہ اتنی اہم بات اس میں سے کہاں غائب ہوگئی۔ممکن ہے جناب مالک رام کے پیش نظر کلیات زیر بحث کی کوئی اور اشاعت ہو یا از قسم مخطوطہ کوئی چیز ان کے پاس ہو جس میں یہ تحریر ہے کہ وہ مولوی فضل خیرآبادی سے ملاقات کے لئے دہلی واپس ہوئے۔

(باز یافت: پروفیسر محمود الٰہی: ترتیب: ڈاکٹر زیبا محمود۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سن 2014 ص 146)

شاہ محمد رفیع الدین کی زیادہ تر شہرت بر صغیر میں قرآن مجید کے لفظی اردو ترجمے کی وجہ سے ہے۔شاہ محمد رفیع الدین مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے تھے کچھ لوگوں کی اختراع یہ ہے کہ یہ ترجمہ ان کا نہ ہو کر ان کے ایک شاگرد سید نجف علی خاں کا ہے۔محمود الٰہی نے اپنے مضمون ''شاہ رفیع الدین دہلوی'' میں اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ سید صاحب نے اس ترجمے کو اردو میں شاہ صاحب کے حکم کے بموجب لکھا ہوگا اور پھر بعد میں شاہ صاحب نے اس کی اصلاح کی ہوگی اس کے بعد یہ شائع ہوا ہوگا۔اس طرح علمی معاونت کی روایت استاد و شاگرد میں بہت پرانی ہے۔محمود الٰہی کے ہی بقول:

''اس دیباچے سے دو خاص باتیں معلوم ہوتی ہیں۔پہلی یہ کہ ترجمہ کلام پاک میں کسی نہ کسی حیثیت سے شاہ صاحب کے ایک شاگرد نجف علی خان کا بھی ہاتھ رہا ہے۔سید صاحب نے شاہ صاحب سے کلام پاک کا لفظی ترجمہ پڑھ کر زبان اردو میں لکھا اور پھر اسے شاہ صاحب نے درست کیا۔ظاہر ہے کہ صاحب نے جو پڑھایا وہی سید صاحب نے لکھا اور اگر تحریر میں کوئی خامی رہ گئی تھی تو شاہ صاحب نے اس کی اصلاح کردی۔تصنیف و تالیف کی دنیا میں اس قسم کے شاگردانہ تعاون کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں اس ترجمے میں سید صاحب کی حیثیت محرر اور کاتب کے علاوہ کچھ اور نہیں تھی۔

(ایضاً 156)

کلیم الدین احمد کے مرتبہ 'تذکرہ شورش' پر اس تذکرے کے مقدمے میں کچھ ایسی باتیں تحریر ہیں جو کوئی ذی عقل اپنے بارے میں تحریر نہیں کرسکتا ہے۔اس طرح سے محمود الٰہی نے اپنے مضمون 'مقدمہ تذکرۂ شورش' میں اس کے ثقہ ہونے پر ہی سوالیہ نشان قائم کیا ہے اور ضمناً انہوں نے اپنے اس تذکرہ شورش کا بھی ذکر کیا ہے جو انہیں بعد میں دستیاب ہوا تھا اور جس میں کہ وہ عبارت درج نہیں ہے جو کلیم الدین احمد کے مرتب کردہ نسخے میں موجود ہے۔اس کے علاوہ بھی اس کے مقدمے میں اور بھی بہت ساری تفاصیل ہیں جو کلیم الدین احمد کے مرتب کردہ نسخے میں نہیں پائی جاتی ہیں۔محمود الٰہی کے ہی بقول:

''یوں اس تذکرے کا احوال جہاں تہاں ملتا رہا ہے لیکن تحقیقی کام کرنے والے کبھی اس سے بھرپور استفادہ نہ کرسکے۔اس کا سبب یہ کہ اس کے صرف ایک قلمی نسخے کا علم تھا جو بوڈلن لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔پروفیسر کلیم الدین احمد نے جنہیں تنقید و تحقیق سے یکساں شغف ہے۔اس نسخے کو شائع کرکے اردو کی بڑی خدمت کی لیکن اس کی اشاعت نے اس کے ثقہ اور مستند ہونے کو ایک مستقل سوال بنا دیا ہے۔کیونکہ اس

میں جہاں شورش کا ذکر ہے وہاں ایسے الفاظ استعمال میں لائے گئے ہیں جنھیں بڑے سے برخود غلط قسم کے لوگ بھی شاید ہی استعمال کرتے ہیں''۔

(ایضاً ص249)

اسی مضمون میں آگے وہ مزید لکھتے ہیں:

''حال ہی میں راقم السطور کو تذکرہ شورش کا ایک اور مخطوطہ دستیاب ہوا۔ جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ آکسفورڈ والے مخطوطے میں کسی نہ کسی حد تک تحریف ضرور ہوئی ہے اس نسخے میں شورش کے ذکر میں اشعار سے پہلے صرف ان کا نام ملتا ہے ۔ آکسفورڈ والے نسخے کی عبارت اس میں نہیں ہے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ شورش کے کسی عقیدت مند نے شورش کا ترجمہ لکھا ہے ۔اس نسخے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شورش کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے جس سے تحقیق کی بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں ۔اس مقدمہ کو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں شورش نے عظیم آباد میں شعری ماحول کا خاکہ پیش کیا ہے اور اپنی علمی وادبی مصروفیات کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں انہوں نے تذکرے کے سبب تالیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور تیسرے حصے میں وہ بیانات آتے ہیں جو شعر کی اہمیت و ماہیت اور اس کے اقسام پر مشتمل ہیں یہ تینوں حصے اپنی جگہ پر اہم ہیں۔

(ایضاً290)

محمود الٰہی کا خیال ہے کہ کسی بھی متن کی تدوین اور اس کو قدیم ترین قرار دیے جانے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کے وقت و زمانہ کا تعین کیا جائے ۔اس ذیل میں وہ اپنے مضمون 'کربل کتھا' میں لکھتے ہیں:

''کسی کتاب کی زمانہ تصنیف کا تعین ایک دشوار کام مانا جاتا ہے یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کتاب کا تعلق کسی قدیم دور سے ہو۔ محقق کا بنیادی کام یہ ہے کہ جس کتاب پر وہ اپنی تحقیق کی بنیاد قائم کرے پہلے اس کے زمانہ تصنیف سے مطمئن ہو جائے ۔ 'کربل کتھا' کے سر پر اردو کی قدیم ترین کتاب کا تاج رکھنے والوں کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ اس کی اشاعت سے پہلے وہ اپنے بنیادی فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں یا نہیں میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ کتاب کی ترتیب میں مرتب نے بڑی محنت کی ہے ،اس کے حواشی، اشاریے، اعلام عربی عبارتوں کی تشریحات، مذہبی روایتوں سے استناد اس کی دوسری باتوں پر غیر معمولی توجہ صرف ہوئی ہے، اگر کوئی کمی ہے تو بس کہ کربل کتھا کے زمانہ تصنیف کا خانہ خالی چھوڑ دیا گیا تھا اور مرتبین کے سامنے اس موضوع سے جو مواد تھا، اسے ایک غلط نگاہ انداز کا بھی مستحق نہیں سمجھا گیا۔ شاید مرتبین یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر زمانہ تصنیف کی بحث میں الجھے تو سارا کرا دھرا ریت کی دیوار کے مماثل ہو جائے۔

(ایضاً ص298)

محمود الٰہی کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' بھی ہے ۔یہ مقالہ انہوں نے پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں شعبہ اردو، علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے مکمل کیا تھا۔ یہ مقالہ پہلی بار 1972 میں طباعت کے زیور سے مزین ہوا ۔یہ مقالہ کم و بیش آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ قصیدہ صنف سخن کی حیثیت سے، عربی اور فارسی قصیدے، اردو قصیدہ نگاری کا ابتدائی دور (دکنی قصیدے) شمالی ہند میں قصیدہ نگاری کا ابتدائی دور ،سوداؔ کی قصیدہ نگاری، سودا کے معاصرین، متوسطین کی قصیدہ نگاری، انشاء، مصحفیؔ، جرأت وغیرہ۔ ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، قصیدہ نگاری کا آخری عہد۔ اسیرؔ، منیرؔ، داغؔ وغیرہ ۔قصیدہ نگاری 1857 کے بعد اور ادبی صنف کی حیثیت سے اس کا مرتبہ۔

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کتاب کی ان سطروں سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

''اردو قصیدے کی ارتقا کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کی یہ غالباً پہلی کوشش ہے۔اس مقالے میں اردو شاعری کی ابتداء سے لے کر دور جدید تک کی قصیدہ نگاری کے اہم رجحانات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور صنف سخن کی حیثیت سے اس کے مرتبے کا تعین کیا گیا ہے ۔ چند اہم اور نمائندہ قصیدہ نگاروں کی تخلیقات پردہ خفا میں تھیں انہیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے''۔

(اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ: پروفیسر محمود الٰہی۔اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو۔سن 2005 ص11)

ناقدین ادب نے قصیدے کے لئے ایک عروضی ڈھانچہ مقرر کر دیا ہے۔ جس کا خیال رکھنا ہر قصیدہ گو کے لئے ضروری ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی مثال یہی ہے سودا نے میر ضاحک کی جو ہجو لکھی ہے وہ مثنوی اور رباعی کے

لئے جو ڈھانچہ مخصوص ہے اس میں ہے اس لئے اس کو 'تضحیک روزگار' کی طرح قصیدہ نہیں کہا جاتا ہے کیوں کہ تضحیک روزگار قصیدے کے لئے جو ڈھانچہ مقرر کیا گیا ہے وہ اسی میں لکھا گیا ہے۔ بقول پروفیسر محمود الٰہی:

''سوداؔ اردو کے بڑے ہجو نگار مانے جاتے ہیں۔انھوں نے مختلف عروضی ڈھانچے میں ہجویں کہی ہیں۔میر ضاحک کی ہجو میں سودا کی مثنوی اور رباعی ان کے قصیدے 'تضحیک روزگار' کی طرح ہجو ہے۔لیکن 'تضحیک روزگار' کو قصیدہ کہا جاتا ہے ،اس لئے کہ وہ قصیدے کے عروضی ڈھانچے میں ہے۔اس کے برعکس میر ضاحک کی ہجو میں جو شعر ہیں انہیں قصیدہ نہیں کہتے ۔اس طرح محسن کا کوروی اردو کے ان نعت گو شعرا میں ہیں،جنھوں نے نعتیہ شاعری کو اعلیٰ ادبی معیار پر پہنچایا ان کی شاعری کا موضوع نعت ہے ۔مگر ان کی نعت مثنوی،قصیدہ،اور غزل کے خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔''

(ایضاً46)

اردو زبان اور شعر و ادب میں دکن کو جو اولیت حاصل ہے وہ کسی بھی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔چنانچہ،مرثیہ اور مثنوی کی طرح قصیدہ بھی پہلی بار یہیں تخلیق پایا۔اس سلسلے میں'' فتح المنار'' کی یاد میں نصرتی نے قصیدہ تحریر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔بقول محمود الٰہی:

''فتح المنار پر نصرتی نے ایک طویل قصیدہ لکھا ہے ۔یہ جتنا طویل ہے اتنا ہی پر شکوہ اور پروقار بھی ہے۔اس قصیدے سے عنصریؔ اور فرخیؔ کے رزمیہ قصیدوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔اس قصیدے کو نصرتی نے خود بے بدل گردانا ہے۔''

(ایضاً ص147)

انشاء اللہ خاں انشاء کے بارے میں عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ اردو کے علاوہ اور کئی زبانوں سے واقف تھے اور وہ اس کا برملا اپنی شاعری میں بھی استعمال کرتے تھے۔محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''انشا متعدد زبانوں کے عالم اور ماہر تھے۔اس علمیت اور مہارت کا مظاہرہ وہ اپنے قصیدوں میں کرتے ہیں۔عربی ،فارسی،ترکی،انگریزی ،بھاشا اور دوسری زبانوں میں وہ مصرعے کے مصرعے اور شعر کے شعر موزوں کر دیتے ہیں۔ان زبانوں کے استعمال کا بظاہر موقع نہیں رہتا مگر وہ اس کا جواز تلاش کر لیتے ہیں'' (ایضاً ص284)

اسی طرح سے ذوق کے بارے میں محمود الٰہی کا خیال ہے کہ وہ کسی فارسی قصیدہ گو کے مقلد و متبع نہ ہوکر انہوں نے پورے طور سے سودا کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں،محمود الٰہی کے ہی بقول:

''ذوقؔ کو اپنے قصیدوں کے لئے فارسی شاعروں کا کلام دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی،انھوں براہ راست سوداؔ سے ،جنھوں نے اپنے قصیدوں میں صدیوں کی فارسی قصیدہ نگاری کی روح پیوست کر لی تھی۔مواد اور اسلوب حاصل کیا۔ذوق کی زبان سودا کی زبان سے کہیں زیادہ صاف اور رواں ہے لیکن فکر و جذبے اور ذاتی مشاہدے کے فقدان نے لفظ و معنی کو ہم آہنگ نہیں ہونے دیا۔جو جوش و خروش سودا کے یہاں ہے ذوق اس سے محروم رہے''۔(ایضاً ص325)

جیسا کہ ماہرین فن جانتے ہیں کہ تنقید کے بغیر نہ تحقیق ممکن ہے اور نہ تحقیق کے بغیر تنقید ۔پروفیسر نورالحسن نقوی اپنی کتاب 'فن تنقید اور اردو تنقید نگاری' میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تنقید کا رتبہ تحقیق سے بلند تر ہے اور یہ درست ہی کہا گیا ہے کہ تنقید نگار کے ایک دماغ میں بہت سے دماغوں کی صلاحیتیں یکجا ہونی چاہیے اور اس کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہیے لیکن تحقیق کی اہمیت کچھ کم نہیں۔تحقیق وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر تنقید نگار اپنی عمارت کھڑی کرتا ہے ۔اس بنیاد کے بغیر عمارت کی تعمیر ممکن نہیں۔اگر یہ نہ معلوم ہو کہ فلاں شعر کس کا ہے اور یہ شاعر کس عہد و ماحول کا ہے تو اس شعر کی تفہیم ممکن ہے نہ تحسین۔میر کی شاعری پر تین مضمون لکھے گئے ۔ہر مضمون نگار نے کسی ایک شعر کو اپنے مضمون کی بنیاد بنایا۔بعد کو تحقیق نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ اشعار میرؔ کے نہیں ہیں۔بنیاد غلط تھی تو ساری عمارت منہدم ہوگئی۔مختصر یہ کہ نہ تحقیق تنقید سے دامن بچا سکتی ہے نہ تنقید تحقیق سے کنارہ کر سکتی ہے۔''

(فن تنقید اور اردو تنقید نگاری: پروفیسر نورالحسن نقوی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ۔2013 ص130)

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ محمود الٰہی تحقیق کے مرد میداں ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری کے میدان میں بھی درک رکھتے ہیں،جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ وجہ چاہے جو بھی رہی ہو ڈرامے کو اردو ادب میں وہ مقبولیت

نہیں حاصل ہوسکی جو اردو کی بعض دیگر اصناف جیسے غزل، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کو حاصل ہوئی۔ محمود الٰہی اس ذیل میں رقمطراز ہیں:

''اندر سبھا کے دور سے لے کر اب تک اردو ڈراما ارتقا کی کئی اہم منزلوں سے گذرا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر نقش پہلے نقش سے زیادہ صاف اور واضح ثابت ہوا لیکن اس نے نہ تو اردو ادب کی رفتار ترقی کا ساتھ دیا اور نہ ایسی قدریں چھوڑیں جو ہمارے لئے سرمایۂ فخر و امتیاز بن سکیں ڈرامے کی پس ماندگی یا شکستگی اور کم مائیگی کا ایک سبب تو یہی ہے کہ غزل، قصیدہ، مرثیہ اور داستانوں کے برعکس یہ کبھی ہمارا مزاج نہ بن سکا۔ اردو ادب کی صنف جو اپنے خالق کا مزاج بن کر سامنے نہیں آتی وہ ہمیشہ بے جان رہتی ہے اور پھر یہ بات بھی تو ہے کہ اردو ڈراما ایک طویل مدت تک ایسے مقامات پر اور ایسے ماحول میں پروان چڑھتا رہا جو اردو کے رنگ و آہنگ سے کوسوں دور تھا، ظاہر ہے جہاں زبان کا نشیب و فراز نہ سمجھا جا سکے وہاں ادب کی تخلیق نہیں ہوسکتی (باز یافت: پروفیسر محمود الٰہی: ترتیب: ڈاکٹر زیبا محمود۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سن 2014 ص 71)

آغا حشر کاشمیری کو ڈرامے کے نقاد اردو ڈرامے کا شیکسپیئر کہتے ہیں۔ محمود الٰہی کو اس سے بھی کلی طور پر اتفاق نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حشر اردو کے دیگر ڈرامہ نگاروں کے مقابلے میں فن ڈرامہ نگاری میں اپنا ایک بلند و اعلیٰ مقام رکھتے ہیں مگر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی نظر سے ڈرامہ کا افادی پہلو یکسر نظر انداز رہا۔ اسی طرح وہ اپنی ڈرامہ نگاری میں کوئی ایسا کردار نہیں خلق کر سکے جو کہ اردو ڈرامہ نگاری میں پوری آب و تاب سے زندہ و تابندہ رہتا اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''لیکن ساتھ ہی اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ حشر کے ڈرامے بھی اردو ادب کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکے۔ یہ صحیح ہے کہ حشر کے ڈراموں نے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی بڑی حد تک تلافی کی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حشر نے صنف ڈرامہ نگاری کو پستیوں سے نکال کر بلندیوں کی راہ پر لگا دیا لیکن ان حقیقتوں کے باوصف حشر ایک بھی کردار پیدا نہ کر سکے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر سکتا، وہ ایک بھی ایسی کہانی نہ پیش کر سکے جو زندگی کے حقائق سے بحث کر سکتی اور وہ ایک بھی ایسا ڈرامانہ لکھ سکے جسے دوسری زبانوں کے ڈراموں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا۔ حشر کے یہاں ڈرامے کی تقریباً تمام خصوصیات ملتی ہیں لیکن ڈرامے کے مقصدی اور افادی پہلو پر انھوں نے توجہ نہیں کی، ان کے یہاں بھی ایک کمی ہے لیکن یہ اتنی بڑی کمی ہے جو انہیں درجہ اول کے ادیبوں اور فن کاروں کی صف میں آنے سے روک دیتی ہے۔ حشر ڈراما کے مجتہد بلکہ امام اعظم ہیں اور ان کے اس اجتہاد سے امام اعظمی پر کبھی حرف نہیں آئے گا، لیکن جب کبھی اردو ادب کی نمائندگی کا سوال پیدا ہوگا تو حشر نمائندوں کی فہرست میں نہ آسکیں گے (ایضاً ص 76)

> پروفیسر صاحب نے اقتضائے وقت کے تحت خوب سے خوب تر انداز میں شاعری کی اور مقبولیت کے بام عروج پر پہنچے۔ اور جب انہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو اصناف شاعری کو ہی اپنے مقالے کا موضوع قصیدہ جیسی پر شکوہ صنف کو بنایا۔ آپ کے مقالے کا موضوع تھا 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' اس مقالہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اعلیٰ تعلیم میں اساتذہ اور طلباء کیلئے اس اہم اور معلوماتی کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسے ارباب ادب نے نظر استحسان سے دیکھا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے اسے علم افروز اور چونکا دینے والی اطلاعات سے تعبیر کیا ہے۔

اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس صنف میں اگر واقعی کوئی کارنامہ انجام پایا ہے تو وہ امتیاز علی تاج کی تصنیف 'انارکلی' ہے اس ڈرامے میں جو ڈرامائی کیفیت، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری، ماحول کی عکاسی، اثر انگیزی ملتی ہے۔ وہ آج تک اردو کے کسی ڈرامے کو نصیب نہ ہوسکی۔ اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''ان ڈراما نگاروں میں امتیاز علی تاج کا نام سرفہرست آتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ڈرامے انارکلی سے بڑھ کر اس صنف میں کوئی تخلیق اب تک نہیں ہوئی۔ اس میں بہ یک وقت اعلیٰ ادبی وزن اور وقار ملتا ہے اور شدید ڈرامائی کیفیات بھی۔ اس سے ڈرامے کے فن اور ادب دونوں کے داعیات کی تسکین ہوتی ہے، پلاٹ کی حسن ترتیب، فنی کردار نگاری، ماحول کی عکاسی، حسب حال مکالمے، شروع سے آخر تک دلچسپی کا وجود، اثر انگیزی اس ڈرامے کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ تاج نے ایک ایسے کردار کی تخلیق کی ہے جس پر کبھی

زوال نہ آئے گا۔انارکلی سے بڑھ کر آج تک اردو ڈرامے کو کوئی کردار نہ ملا۔کردار وہی اچھا ہوتا ہے جو ہر زمانے کا ساتھ دے جس کی دلکشی انقلاب زمانہ کے باوجود کم نہ ہو جس کے نقوش تاریخ کے ہر ورق پر ثبت ہوں جس کی حرکت وعمل پر لوگ فخر بھی کریں اور رشک بھی انارکلی کے کردار میں یہ خصوصیت پورے طور پر ملتی ہیں۔تاج کی باریک بیں نگاہ نے انار کلی کے کردار کو امر اور لافانی بنا دیا''۔(ایضاً81)

ناقدین فن کے لئے یہ ایک بڑا سوال ہے کہ کیوں قصیدے کو دبستان دہلی میں جو اہمیت ملی ہوئی وہ دبستان لکھنؤ میں حاصل نہ ہوسکی۔محمود الٰہی نے اپنے مضمون 'لکھنؤ اسکول اور قصیدہ نگاری' میں اس سوال کا جواب دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اردو شاعری وہ غزل ہو یا قصیدہ مثنوی ہو یا قطعہ زیادہ تر اظہار فضل و کمال کے مقصد سے وابستہ رہی ہے۔قصیدے کی ادبی اور فنی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ میں جو چشمک بڑھی وہ غزل کے میدان میں۔غزل ہی کو سکہ رائج الوقت مانا گیا ۔لکھنؤ والوں نے اپنا ایک ممتاز دبستان شاعری بنانے کے لئے غزل کو آلہ کار بنایا اور ساری صلاحتیں اس کے بنانے اور سنوارنے میں صرف کردیں اصلاح زبان یا نئے دبستان شاعری کا محور غزل ہی قرار پائی۔۔۔۔۔ہمارے یہاں بہت کم شاعروں کو ابداع اور اختراع کی قوت ملتی ہے ۔ایک مشہور شاعر نے جو روش اختیار کی یا زمین نکالی اس پر قافلہ چل پڑا۔اس رواداری میں بہت سے شاعروں کی فطری صلاحیتیں دب کر رہ گئیں۔ناسخ و آتش نے صرف غزل گوئی کو اظہار فضل وکمال کا ذریعہ اور شاعرانہ فن کاری کا امتحان سمجھا تو سارے لکھنؤ نے ہاں میں ہاں ملائی اور کبھی معاصرانہ چشمک بھی بڑھی تو غزل ہی کے سلسلے میں.....''ناسخ و آتش کے یہاں اس قسم کے مدحیہ،نعتیہ اور منقبتی شعر ملتے ہیں جو قصیدے کے انداز مداحی سے الگ نہیں اس لئے اس پہلو پر سوچنا ہی غلط ہے کہ وہ مذہبی یا درباری مداحی کے کام کے نہیں تھے۔لکھنؤ میں قصیدہ نگاری کے فروغ نہ پانے کا ایک سبب یہ ہے کہ غزل گوئی کی گرم بازاری میں قصیدے کی ادبی اور فنی اہمیت کو بھلا دیا گیا۔قصیدہ شاعرانہ فضل و کمال کا ذریعہ نہیں رہ گیا تھا اس لئے یہ صنف رفتہ رفتہ غائب رہنے لگی۔''

(ایضاً ص177)

محمود الٰہی کا خیال ہے کہ 1935 کے بعد سے اردو ادب میں تنقید کا غلبہ رہا ہے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ بہت سے مصنف جو اچھا ادب تخلیق کر سکتے تھے انہوں نے تنقیدیں لکھنی شروع کردیں۔وہ اپنے ایک مضمون 'احتشام حسین بحیثیت نقاد' میں لکھتے ہیں:

''پچھلے پچیس تیس سال میں تنقیدی ادب کا جو اضافہ ہوا ہے وہ کوئی تشویش ناک بات نہیں لیکن اس اضافے کے دوران مقابلے اور مسابقت کی روح دوڑتی رہی ۔کسی شاعر،ادیب یا نقاد نے اس کا اظہار کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد سے اردو کی تخلیقی قوتوں پر تنقید حاوی رہی ہے اور نظریاتی طور پر نہ سہی لیکن عملی طور پر تنقید کے مقابلے میں تخلیق ایک کمتر درجے کی چیز سمجھی جاتی رہی ہے،ناقدین نے تنقید کے باب میں کتنا ہی عجز و انکسار سے کام کیوں نہ لیا ہو لیکن تنقید کی برتری کے نقوش ہمارے پچھلے ربع صدی کے لٹریچر میں پہچانے جاسکتے ہیں،یہاں اس پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے کہ کیا تنقید کی برتری نے اعلیٰ تخلیقی ادب کی نشو ونما روک دی؟ لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ برتری کے بڑھتے ہوئے رجحان نے بہت سی ادبی اور شعری صلاحیتوں کو گمراہ کردیا۔جو لوگ اچھے ادب اور اچھے شعر کی تخلیق کر سکتے تھے انھوں نے اپنا موضوع بدل دیا اور وہ تنقید کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔صرف یہی نہیں کہ جن کی تخلیقی صلاحیتیں زیر تربیت تھی وہی تنقید کی طرف بڑھنے لگے بلکہ جنہیں تخلیق ادب میں حسن قبول حاصل ہو چکا تھا ان کے ہاتھ میں بھی نقاد کا قلم آ گیا''۔(ایضاً ص271)

محمود الٰہی ہماری زبان کے قد آور محقق اور ناقد ہیں،افسوس کا مقام ہے کہ ان پر جس لحاظ سے لکھنے جانے کی ضرورت تھی ابھی تک یہ کام انجام نہیں پا سکا ہے۔لے دے کے اب تک ان پہ جو کچھ بھی ہے وہ ہے محمد شمس الدین کی کتاب 'محمود الٰہی: حیات و خدمات' جو فی الحقیقت ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔یا پھر کچھ رسالوں کے نمبرات ہیں۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ وقت کب آتا ہے جب ان کی خدمات کا اردو کی مقتدر شخصیات و ادارے اعتراف کرتے ہیں۔بقول داغ:

' ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں'

□□□

پروفیسر محمود الٰہی کی طنزیہ تحریریں

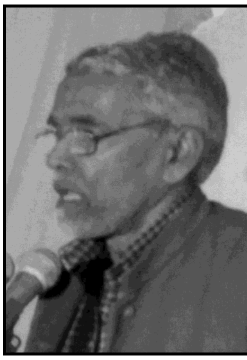

ڈاکٹر شکیل احمد

قاسمی منزل، ڈومن پورہ،
مئوناتھ بھنجن، یوپی
رابطہ: 9236722570

نثر ہو یا شاعری، ہر دور کے قلم کار نے مروجہ اصناف میں اپنی نگارشات پیش کی ہیں۔ خداداد صلاحیت اور طبعی میلان کے زیر اثر وہ اپنے محسوسات اور خیالات کو قاری تک پہنچاتا ہے۔ سنجیدہ اور فکر انگیز تحریر کی طرح طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب بھی ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ چونکہ طنز نگاری کا سماجی رشتہ مضبوط، مشاہدہ تیز، نگاہ دور بین، فکر دور رس، مزاج نکتہ داں اور جرأت گفتار ایسی ہوتی ہے جو قاری کے دل کو چھونے کے ساتھ متاثر بھی کرتی ہے اور یہی طنز نگاری کا کمال بھی ہے۔ اکثر ماہرین فن مصر ہیں کہ بعض اوقات وہ مسائل یا امور جو سنجیدہ لب ولہجہ میں قاری کو حسب منشاء متاثر نہیں کرتے، ان کو طنز نگار زیادہ کارگر طور پر قاری تک پہنچانے اور متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں کڑوی دوا بصورت کیپسول کی مثال بھی دی جاتی ہے۔ بیشتر طنز و مزاح نگار حضرات نے اپنی نگارشات کو اپنے اصل نام یا قلمی نام سے پیش کیا ہے جیسے پروفیسر رشید احمد صدیقی یا فکر تونسوی جیسے حضرات نے اور بعض نے فرضی نام سے اپنی نگارشات پیش کی ہیں جیسے مولانا عامر عثمانی نے ملا ابن العرب مکی کے فرضی نام سے۔

پروفیسر محمود الٰہی صاحب اردو کے نامور محقق، معلم، نقاد اور مبصر و منتظم تھے۔ گورکھپور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ہونے کے باوصف یوپی اردو اکادمی کے تین بار چیئرمین بھی رہے۔ آپ کے اندر کے طنز نگار، 'نباض' کے فرضی نام سے اردو اکادمی کے 'خبرنامہ' میں طنزیہ تحریر کے ذریعہ اردو قبیلہ کو جھنجھوڑنے، بیدار کرنے، اکسانے اور غیر دلانے کی ذمہ داری بھی نبھاتے تھے۔ ان 'نباض' کے بارے میں کچھ حضرات تو بہت بعد میں واقف ہوئے مگر 'مقطع میں آپڑی ہے......' کے عنوان سے یہ طنزیہ ہر قاری کو متاثر ضرور کرتا تھا۔ اردو کے سچے بہی خواہوں اور شیدائیوں کو وقتی مفاد پرستوں اور موقع شناسوں سے متواتر آگاہ بھی کرتا تھا۔

'نباض' کے 'مقطع میں آپڑی ہے......' خبرنامہ (مئی۔ جون ۱۹۸۱ء) کے مشترکہ شمارے سے لے کر اگست ۱۹۸۳ء کے شمارے تک دستیاب ہو سکا ہے اور اسی کی بنیاد پر پروفیسر محمود الٰہی صاحب

کے طنزیہ اسلوب اور لب ولہجہ پر گفتگو مقصود ہے۔ چوبیس کی تعداد میں طنزیہ پڑھنے سے زیادہ غور کرنے، خود احتسابی کرنے اور اردو کے ہر قسم کے مفاد پرست اور نامخلص حضرات کو اپنے گریبان میں جھانکنے اور آئینے میں خود کو دیکھنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ اس طنزیہ کالم میں اردو طلبہ، اساتذہ، معیار تدریس، نصاب تعلیم، تحقیقی روش اور اردو کے نام پر سیمینار، جلسے اور میلہ لگانے والے نامخلصوں سے اردو دنیا کو واقف کرانے کی پیہم کوشش کی جاتی رہی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ 'نباض' اردو کے مثالی استاد، وقت کی پابندی کرنے والے معلم اور اردو کی عملی جد وجہد کرنے والے لکچرر اور پروفیسر رہے ہیں۔ انہوں نے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ یونیورسٹی سے وابستہ جن کالجوں میں اردو کے شعبہ قائم تھے، ان کے علاوہ جہاں اور جن کالجوں میں اردو کے شعبہ قائم نہیں تھے۔ ایسے ستائیس کالجوں میں آپ نے یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران شعبے قائم کرائے اور اس کے لئے ہر سطح پر متواتر کوشش کر کے اردو دنیا کی دانشگاہوں سے وابستہ اساتذۂ کرام اور پروفیسر صاحبان کو اردو کے فروغ اور سچی خدمت کی راہ دکھائی۔ آپ نے چند ایک سیمینار کے علاوہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں کبھی سیمینار کے انعقاد پر اپنی توانائی صرف نہیں کی بلکہ اس توانائی کا استعمال قصبات اور دور افتادہ علاقوں میں واقع کالجوں میں اردو کی تدریس، ان کالجوں میں لائق اساتذہ کی تقرری اور اردو والوں کو اپنی زبان سے محبت اور محنت کے گُر سکھانے میں کیا۔ اپنے قیام سے لے کر تا دمِ تحریر یوپی اردو اکادمی نے متعدد چیئر مین حضرات کا دور دیکھا ہے۔ نہ صرف اتر پردیش بلکہ اردو دنیا گواہ ہے کہ جس خلوص، دیانت، ہمت، لگن، وسیع القلبی اور جرأت کے ساتھ 'نباض' یعنی پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے اکادمی کی سربراہی کی اور اردو کے تعلق سے اسے جس قدر فعال اور مفید ادارہ بنا دیا وہ دیگر حضرات کے حصہ میں نہیں آیا۔ ایسے خادم اردو کو حق پہنچتا ہے اور زیب دیتا ہے کہ وہ 'نباض' بن کر اردو کے ساتھ ستم شعاری کرنے والوں کی نبض ٹٹولیں اور اردو کی اصل بیماری سے بہی خواہان اردو کو مطلع اور آگاہ فرمائیں۔

اردو کی نشو و نما اور ترقی کا مرحلہ تعلیم گاہوں سے شروع ہوتا ہے۔ اردو کے ابتدائی درجات سے اردو سیکھنے لکھنے اور پڑھنے کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہی اعلیٰ تعلیم اور اس کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔ مختلف سطح کی ان تعلیم گاہوں میں کیا ہوتا ہے، 'نباض' کی زبانی سنئے:

> 'اس نے (نوجوان پروفیسر نے) مثال میں خود اپنی ذات کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب میں پروفیسر ہوا میں نے بڑی محنت سے ایک نوٹ بک تیار کی جسے میرے طلبہ کلاس نوٹ کے نام سے یاد کرتے آئے ہیں۔ میں سال بہ سال اسی کلاس نوٹ سے طلبہ کو سیراب کرتا رہتا ہوں اور کمال یہ ہے کہ میں حاضر رہوں یا غائب، اپنی کلاس نوٹ سے طلبہ کو سیراب کرتا رہوں گا۔' بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، ہمارے طلبہ میں اگر کوئی پروفیسر ہو جاتا ہے تو پھر اسی نوٹ سے وہ اپنے طلبہ کو مستفید کرتا ہے۔ گویا پروفیسر کا نوٹ ایک صدقہ جاریہ ہے اور:
>
> 'اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے'

'نباض' خبرنامہ (مارچ ۱۹۸۲ء)

کلاس نوٹ کا کرشمہ 'مقطع میں آپڑی ہے......' میں ان لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

> 'کلاس نوٹ کی صنعت جب سے ایجاد ہوئی ہے تعلیم و تعلم کے صدہا مسائل میں نے حل کر دئے ہیں۔ آپ ایک بار محنت کر کے کلاس نوٹ تیار کر لیجئے پھر اسے صدقۂ جاریہ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بیمے کے پریمیم کی طرح تنخواہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی رہے گی۔ آج کل کی مصروف زندگی میں طلبہ کے لئے تو یہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ گھر بیٹھے اسے کلاس روم کا جلوہ نظر آجاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ امتحان کے موقع پر امپارٹینٹ معلوم کرنے کے نام پر وہ در بدری سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یہ تجربہ ہو گیا ہے۔ کلاس نوٹ کو نظر انداز کر کے کوئی امتحانی سوال نہیں آسکتا۔'
>
> 'اس کلاس نوٹ صنعت کا ایک اور رخ بھی ہے جس کا جلوہ مجھے حال ہی میں نظر آیا۔ ایم اے کے زبانی امتحان میں میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا کہ ایم اے میں نثر کی کون سی کتابیں داخل نصاب ہیں؟ اس نے برجستہ جواب دیا۔ 'رانی کیتلی' انشاء اللہ خاں انشاء جس کے مصنف ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ کلاس نوٹ میں 'رانی کیتکی' کی جگہ 'رانی کیتلی' چھپ گیا ہوگا۔'

ہماری درس گاہوں میں اردو تدریس کس قدر زوال آمادہ ہے اور اساتذہ کے نکمے پن کی وجہ سے طلبہ کو محنت کا خوگر نہ بنا کر آسان راہ پر ڈالا جا رہا ہے۔ جہاں صرف امتحان پاس کر لینا مقصد

بن چکا ہے اور جہاں سے طلبہ وطالبات کے ذہن و فکر میں زبان وادب کا کوئی پہلو روشن نہیں ہو پاتا۔ ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ان کی مارکشیٹ میں ہوتا ہے۔علمی صلاحیت کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔اپریل ۱۹۸۳ء کے ’مقطع میں آپڑی ہے.....‘ کا پورا اقتباس اردو کے بعض اساتذہ کی علمی اور تدریسی صلاحیتوں کو آئینہ دکھا رہا ہے:

’ایک بار نصاب کی جو کتاب بدلی تو ماسٹر صاحب اسے دیکھ کر معلمی کا پیشہ چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ ماسٹر صاحب تھے ایماندار آدمی، وہ بڑی محنت سے داخل نصاب شاعروں پر نوٹ تیار کرتے تھے اور طلبہ کو مطمئن کر لینے کے بعد ہی آگے بڑھتے تھے۔ان کی تدریسی زندگی میں کئی بار نصاب کی کتابیں بدلیں مگر اس تبدیلی سے ان کا ذوق تدریس متاثر نہیں ہوا کیونکہ گھوم پھر کے وہی شعراء نئی کتاب میں شامل رہتے تھے۔ لیکن اب کے ایک نیا شاعر نصاب میں داخل ہو گیا تھا اور ایک دو نہیں اس کی ساٹھ ستر غزلیں منتخب کی گئی تھیں۔ وہ شاعر تھا ’ایضاً‘ میرؔ کی ایک غزل کے بعد چند غزلیں ’ایضاً‘ کی تھیں۔اس کے بعد غالبؔ کی ایک غزل تھی اور چند غزلیں ’ایضاً‘ کی۔غرض اس طرح ہر مشہور شاعر کی ایک ایک غزل کے بعد متعدد غزلیں ’ایضاً‘ کی تھیں۔ ماسٹر صاحب نے شعراء کے تذکرے دیکھے، اردو ادب کی تاریخیں پڑھیں، ترقی پسند اور جدید شعراء کے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کیا مگر انہیں ’ایضاً‘ کا ذکر کہیں نہیں ملا۔‘

مذکورہ چند اقتباسات سے پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی اردو تدریس کے موجودہ افسوسناک صورت حال کو لے کر تشویش واضح ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی ۳۳ رسالہ تدریسی زندگی میں اردو اساتذہ کے سینکڑوں تقرر کالج اور یونیورسیوں میں کئے اور ہر جگہ معلم کی صلاحیت کو معیار بنایا تاکہ وہ اردو طلبہ کو اپنی علمی صلاحیتوں سے ترقی کی راہ پر چلا سکے کیونکہ ایک بے صلاحیت استاد اپنی برسوں کی ملازمت کے دوران ہزاروں طلبہ وطالبات کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے اپنے شاگردوں کو بھی کندۂ ناتراش کی صورت میں آگے بڑھنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

اردو کے ساتھ ہونے والی ستم ظریفیوں میں تدریس کے ساتھ تحقیق کے نام پر ہونے والی تن آسانیوں اور بد دیانتیوں کا بھی حصہ ہے۔اس راہ سے تحقیق کے راہیوں نے ایسے ایسے نقوش پا چھوڑے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔تحقیق کی قدیم روش مایوسی سے کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہے۔’مقطع میں آپڑی ہے.....‘ کے تحت کئی جگہ اس کی طرف طنز اور افسوس کے ساتھ انگشت نمائی کی گئی ہے۔اپریل ۱۹۸۲ء کے خبرنامہ میں ’مقطع میں آپڑی ہے.....‘ میں ’شربت تنقید‘ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

’شربت تنقید کی شہرت نیم حکیموں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔آن کی آن میں سیکڑوں دواخانے وجود میں آئے اور شربت تنقید کی ہزاروں قسمیں بازار میں دستیاب ہونے لگیں.....ان میں اکثر ایسے تھے جن کے دیدے کا پانی نہیں مرا تھا۔ وہ تحقیق کا دامن بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اور سکۂ رائج الوقت یعنی ’شربت تنقید‘ سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتے تھے۔آخر انہیں ایک تدبیر سوجھی اور انہوں نے ’شربت تنقید بہ نسخۂ تحقیق‘ کا اشتہار جاری کیا۔شربت تنقید کیا جاری ہوا کہ شہر کے لڑکوں کی مراد بر آئی۔ شربت تنقید کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ اساتذہ کا کلام دیکھے۔ جب شربت تنقید کے ایک گھونٹ سے اساتذہ کی روح آئینہ ہو جاتی ہے تو کلام کے افہام وتفہیم میں جان کون کھپائے۔‘

’نباض‘ کی انگلی نے اردو زبان وادب کے نام نہاد خادموں اور رسمی مجلس آرائیاں کرنے والوں کی خوب خوب نبض ٹٹولی ہے۔’مقطع میں آپڑی ہے.....‘ میں خبرنامہ کے متعدد شماروں میں مختلف عنوانات کے تحت ان کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ادبی جلسے، سیمینار، اردو کے فروغ کی تحریک، اردو کے ساتھ زیادتی کا مستقل شکوہ کرنے والے حضرات کی نت نئے رنگ ڈھنگ کو اجاگر کیا گیا ہے۔اردو خدمت کے نام پر جو لوٹ مفاد پرستوں کے نام پر مچی ہوئی ہے اس کی منظرکشی ’مقابلۂ حسن خدمت‘ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے خبرنامہ میں ان الفاظ میں موجود ہے:

’آج ابھی یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ اردو کی سب سے زیادہ خدمت کس نے کی ہے..... کوئی کہتا تھا کہ فلاں سرفہرست ہوگا کیونکہ وہ بال بچوں سمیت اردو کی خدمت میں مصروف رہا ہے اور کوئی کہتا تھا کہ فلاں تو اس مقابلہ میں ٹک ہی نہیں سکتا کیونکہ اس نے اردو کے نام پر کمایا تو بہت لیکن بچایا کچھ نہیں۔اس کے پاس ایک کوٹھی اور ایک کار کے علاوہ ہے کیا!‘

جولائی ۱۹۸۲ء کے خبرنامہ میں اردو کے ساتھ رسمی محبت کرنے والوں کو نشانہ پر لیتے ہیں:

'اردو کے دورِ زوال کی جب تاریخ مرتب ہوگی تو اگر ایک طرف یہ انتہائی عبرت ناک اور لرزہ خیز ہوگی تو دوسری طرف بیحد دلچسپ اور نشاط انگیز۔ اس میں یہ طور ضمیر اردو کا استحصال کرنے والوں کی ایک فہرست بھی ہوگی جس میں آج کے بہت سے پردہ نشینوں نے اردو میں گروہ بندی صف آرائی اور نفرت وتشدد کا ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ شیطنت کو غش آرہا ہے اور فرعونیت تھرا رہی ہے۔ یہ علم و ادب کی دنیا میں درآئے تو ہیں لیکن ان کے اسی ذوق علم اور ذوق ادب کے علاوہ ہر وہ چیز موجود ہے جس کی حصول اقتدار کے راستے میں ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی جائز آمدنی اتنی ہی ہے جتنی ان کے دوسرے ہم چشموں کی ہے مگر ان کے پاس کوٹھیاں ہیں۔ عمدہ کاریں ہیں اور لذت افروزی کے وافر ذرائع۔ یہ اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے یہ خود مادرِ اردو ہیں اور اردو کی کسمپرسی ان سے دیکھی نہیں جاتی......سوچتا ہوں اگر کبھی ان دانشوروں کی آنکھ کا پردہ کھلا اور ان کی سمجھ میں آگیا کہ اردو کو رسوا کرنے کے لئے وہ کس کس طرح استعمال ہوئے ہیں تو ان کے عرقِ انفعال کو موتی سمجھ کر کوئی چننے والا بھی ملے گا کہ نہیں۔'

یہیں پر بس نہیں بلکہ اگست ۱۹۸۲ء کے خبرنامہ میں اسی کالم کا آخری اقتباس بھی ملاحظہ کرلیں:

'در اصل ادب کو لوگوں نے جنگ زرگری بنا دیا ہے اور اس جنگ میں نظریئے سے زیادہ دَل بدَل ہی کام آتی ہے۔ مجھے تو کوئی ادیب نہیں ملا جس کی دل بدلی ہوس، سیر و تماشا اور جلب منفعت سے عاری ہو'

مگر اس سے بھی زیادہ تلخ لہجے میں جس میں طنز کی لے بھی خاصی اونچی ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء کے خبرنامہ میں 'نباض' کا پورا اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

'ایک بار اس خاکسار کو ایک ایسے خصوصی جلسے میں شرکت کا موقع ملا جہاں اردو کے فروغ کے لئے بعض تجویزیں زیر غور تھیں۔ ایک صاحب نے جیسے ہی اردو کی تعلیم کا مسئلہ اٹھایا، ایک دوسرے صاحب نے بعض شاعروں کے لوحِ مزار کی بات چھیڑ دی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ جلسے میں کیا طے ہوا۔ میں تو یہ کہہ کر چلا آیا کہ اردو کے لوح مزاج کی تعمیر وتنصیب کو بھی ایجنڈے میں شامل کرلیجئے مگر کچھ دنوں کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے علمی اور تحقیقی ادارے کے رکن بنا دئے گئے ہیں۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اردو والے ان ادبی سیاست کے شاطروں اور بردہ فروش برادران یوسف کو پہچان سکیں!!!'

اب تک 'نباض' کی خامہ فرسائی کے جتنے نمونے پیش کئے گئے وہ اردو کے نام پر اردو کی تباہی اور زبوں حالی میں شریک حضرات کے کام اور چہرے ہیں خواہ طلبہ ہوں، اساتذہ ہوں یا اردو کے نام پر انجمن آرائی کرنے والے افراد۔ پہلے لکھ چکا ہوں کہ کھری کھوٹی وہی سنا سکتا ہے یا لکھ سکتا ہے جس نے اردو کی صدق دل سے خدمت کی ہو۔ اپنی جیب سے رقم نکال کر اردو کے لئے کچھ کیا ہو۔ جس نے اردو کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے اس کی کیاریوں میں اپنی محنت، لگن اور جانفشانی کا پانی انڈیلا ہو۔ ایسے خادم اردو اور ایسے معلم اردو کو جب یہ نظر آئے گا کہ اس کے اپنے قبیلے کے لوگ ہی اردو کی جڑوں میں گرم پانی کی آبیاری کر رہے ہیں تو 'مقطع میں آپڑی ہے......' میں 'نباض' بن کر اردو کی بقا کی جدوجہد میں پیچھے نہیں رہ سکتا۔

پروفیسر محمود الٰہی کی پوری زندگی، اردو سے ان کی سچی خدمت کی آئینہ دار ہے۔ جن حضرات کو اس میں کلام ہو یا جنہیں میرے دعوے میں مبالغہ نظر آئے، انہیں اردو اکادمی کے عہد زریں کی ان تمام خدمات کا جائزہ لینا چاہئے جو مرحوم کے عہد میں ہوئیں اور اکادمی کے سربراہ ہونے کے دوران اردو نصابی کتب، نادر حوالہ جاتی مآخذ اور مولانا آزاد صدی تقریبات کے دوران اشاعت کے اس عظیم کارناموں کی صورت میں سامنے آئیں۔ اس کے بعد بھی اگر ذہن و دل کے کسی گوشے میں اشکال رہ جائے تو گورکھپور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ان کے دور کا ایک جائزہ بھی لینا مناسب ہوگا جہاں سے درجنوں کی تعداد میں اردو کے لائق اساتذہ ملک کی نامور یونیورسٹیوں میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے سبکدوش ہو چکے ہیں اور جن کے تحقیقی اور تصنیفی کارنامے سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔

'مقطع میں آپڑی ہے......' کالم میں 'نباض' کے فرضی نام سے پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے جو طنز نگاری پیش کی ہے اس کا دائرہ اگر چہ اردو درس وتدریس اور جلسہ وسیمینار تک محدود ہے لیکن اس میں طنز کی جو اونچی لے ہے اس کی بازگشت ایک مدت تک سنائی دیتی رہے گی۔

۱۔ رشحات (پروفیسر محمود الٰہی کی ادبی کاوشیں) تلاش وترتیب، ڈاکٹر سلیم احمد، ڈاکٹر قدسیہ بانو، میں اس طنزیہ کالم کو صفحہ ۲۹۹ سے ۳۵۱ تک شامل کیا گیا ہے۔ تمام اقتباسات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔

□□□

پروفیسر محمود الٰہی اور مقدمات کتب و رسائل

ڈاکٹر ثوبان سعید
خواجہ معین الدین چشتی
اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ
رابطہ: 9411827716

پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ علم و ادب اور عزم و عمل دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ علم و ادب کے میدان میں ان کے ابرِ دید و دانش نے وہ گہر باری کی کہ تاریخ ادب کی ورق گردانی کرنے والا کوئی شخص ان کی خدمات کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ان کے قلم سے اردو زبان کی تاریخ و تنقید نیز قصیدہ نگاری کے باب میں جو معیاری کارہائے نمایاں سامنے آئے ہیں، وہ نئی نسل کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ محمود الٰہی صاحب کی جدوجہدِ حیات کا دوسرا پہلو خالص عملی تھا، یعنی حیات و کائنات کے رموز و مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ زمانے کے نبض شناس تھے، بلکہ اس کے سرد و گرم اور سمت و رفتار سے بھی خاطر خواہ واقفیت رکھتے تھے اور اسی کا فیضان تھا کہ طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کی تربیت وہ اس نہج پر کرتے تھے کہ بہت جلد وہ طلبہ اساتذہ کے مرتبے پر فائز ہوجاتے۔ محمود الٰہی صاحب کے شاگردوں کی تعداد خاصی ہے جنھوں نے اردو ادب کے مختلف اعلا تعلیمی اداروں میں نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ بنائی، بلکہ قابل ذکر کارنامے بھی انجام دیے۔ ایک زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ پروفیسر الٰہی کا کوئی ریسرچ اسکالر یونیورسٹی سے صرف پی ایچ۔ڈی کی ڈگری لے کر نہیں نکلتا، بلکہ اس کے ہاتھ میں پروانۂ ملازمت بھی ہوتا ہے۔ الغرض پروفیسر موصوف کی زندگی کے اس مشفقانہ اور مربیانہ پہلو کو ان کی عالی ظرفی اور ہمدردی کے استعارے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جو ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو منور کرتا ہے۔

محمود الٰہی صاحب کی ادبی خدمات و نگارشات اتنی وقیع ہیں، اور ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ایک مختصر مقالے میں نہ تو ان پر سیر حاصل گفتگو ممکن ہے، اور نہ ہی یہ مقالہ ان کی خدمات کے مکمل احاطے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ محمود الٰہی صاحب کے ان مقالات و مقدمات، نیز تقریظات کی تعداد بھی خاصی ہے جو انھوں نے اتر پردیش اردو اکادمی کی چیرمین شپ کے دوران کتابوں کی اشاعت کے وقت قلم بند کی تھیں۔ ڈاکٹر سلیم احمد صاحب اور ڈاکٹر قدسیہ بانو نے بڑی محنت و کاوش سے ان تحریروں کو ''رشحات'' کے عنوان سے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتاب کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اس

میں مرتبین نے چار ابواب قائم کیے ہیں، اور الٰہی صاحب کی مختلف تحریروں کو علاحدہ باب کے تحت یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کی ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے زائد ہے۔ بابِ اوّل میں محمود الٰہی صاحب کے وہ مقدمات شامل ہیں، جو انھوں نے مختلف کتابوں کی ترتیب وتدوین کے دوران تحریر کیے تھے۔ زیرِ نظر مضمون میں انھی منتخب مقدمات کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔

بابِ دوم ان منتخب پیش لفظ پر مشتمل ہے، جو اتر پردیش اردو اکادمی کی مطبوعات پر بہ حیثیت چیرمین پروفیسر الٰہی نے قلم بند کیے تھے۔ کتاب کے مرتب مقدمے میں رقمطراز ہیں:

''یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مولانا آزاد صد سالہ تقریب کے موقع پر آپ اتر پردیش اردو اکادمی کے چیرمین تھے۔ چوں کہ انھیں مولانا آزاد کی تحریروں اور صحافت سے والہانہ انسیت تھی۔ لہٰذا انھوں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا، اور ملک کے مشاہیر قلم کاروں سے ایک سو کتابیں لکھوا کر اردو اکادمی سے شائع کیا۔ اس موقع پر جو بھی کتابیں شائع ہوئیں، ان سبھی پر بحیثیت چیرمین انھوں نے پیش لفظ لکھا۔ مختلف موضوعات اور اصناف پر لکھی گئی کتابوں پر پیش لفظ لکھنا آسان کام نہیں تھا۔ چوں کہ موصوف کا مطالعہ وسیع تھا اور ادب کی مختلف اصناف پر ان کی گرفت تھی، اس لیے انھوں نے جو بھی پیش لفظ لکھے خواہ وہ مختصر ہوں یا طویل، ان کی ایک ادبی حیثیت ہے۔'' [رشحات، ص 16-17]

بابِ سوم الٰہی صاحب کی ان طنزیہ ومزاحیہ تحریروں کا احاطہ کرتا ہے جو انھوں نے ماہنامہ 'خبر نامہ' کے لیے قلم بند کیے تھے۔ باب چہارم میں محمود الٰہی صاحب کی دست یاب نظموں کو پیش کیا ہے۔ یہ بات کم لوگ ہی جانتے ہیں کہ پروفیسر الٰہی ایک زمانے میں شاعری کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہے تھے۔ ملک زادہ منظور احمد نے خود نوشت 'رقصِ شرر' میں لکھا ہے:

''...... محمود الٰہی اس زمانے میں شعر وشاعری کرتے تھے، اور ان کا 'زخمی' تخلص تھا۔ یہ ہندی گورکھپوری کے شاگرد تھے، اور میرے اس دور کے دوستوں میں تھے۔ بعد میں جب انھوں نے علی گڑھ جا کر اعلا تعلیم حاصل کی اور اردو قصیدہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی ہوئے تو انھیں رضا ڈگری کالج رام پور میں لکچرر کی جگہ مل گئی۔ شعر وشاعری کا ذوق اس وقت بھی تھا، مگر گورکھپور یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو ہونے کے بعد انھوں نے یہ کارِ زیاں ترک کر دیا اور اپنے تخلص کا استعمال بھی کبھی نہ کیا۔ وہ ایک اچھے محقق اور انشا پرداز تو ہوئے لیکن اگر انھوں نے شاعری ترک نہ کی ہوتی تو ایک بے مثال شاعر بھی ہوتے۔ ...... کچھ مشاعروں میں وہ جگنو کی طرح چمکے اور پھر ڈوب گئے۔ مگر ڈوبنے کے بعد جب وہ دوبارہ ابھرے تو نثر کا میدان ان کے سامنے تھا۔''

[رقصِ شرر، ص 98-99]

مقدمہ نگاری کے باب میں اردو کے جن معدودے چند قلم کاروں کا نام لیا جا سکتا ہے، ان میں مولوی عبدالحق کا نام بہت اہم ہے۔ مولوی صاحب کی خدمات بے حد وقیع اور اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اردو کے لیے بے لوث اور ان تھک کام کیا۔ مختلف سیاسی محاذوں پر وہ اردو کا دفاع بھی کرتے رہے۔ ان سب کے علاوہ مولوی صاحب نے قدیم متون اور تذکروں کو نہ صرف یہ کہ تلاش کیا، بلکہ اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ ان کو شائع بھی کیا۔ ان کے طرزِ تحقیق سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ مولوی صاحب کے نتائج پر ہر شخص آمنا وصدقنا کہے۔ اس کے باوجود ان مقدمات وحواشی کی اہمیت مسلم ہے۔ تحقیق کا قافلہ اگرچہ ترقی کے کئی منازل طے کر چکا ہے، اور نئے نئے حقائق تاریخ ادب کے مسلمات پر خطِ تنسیخ کھینچ چکے ہیں، پھر بھی مولوی صاحب کے کارناموں کی اہمیت اور ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے، نیز ہم آج بھی مرجع وماخذ کے طور پر ان سے رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔

پاکستان میں مولوی صاحب کی روایت کو مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت مثبت انداز میں آگے بڑھایا، یعنی قدیم متون اور کلاسیکی کتابوں کو مدون کرنے اور ان پر تعارفی اور تنقیدی مقدمے لکھنے کا کام ان لوگوں نے کیا۔ ہندوستان میں جن قلم کاروں نے یہ بارِ گراں اپنے کندھوں پر اٹھایا، ان میں پروفیسر محمود الٰہی صاحب کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔ محمود الٰہی صاحب نے اتر پردیش اردو اکادمی کی چیرمین شپ کے دوران قدیم متون کی تدوین کا کام خود بھی کیا اور دوسروں سے بھی کرایا، نیز انھیں اپنے مقدمات وحواشی کے ساتھ شائع کیا۔

مقدمہ نگاری کی بنیادی غرض یہ ہوتی ہے کہ مقدمہ نگار پیش نظر کتاب کی اہمیت کو صحیح معنوں میں روشن کرنے میں کامیاب ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقدمے میں ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی جائے جو کتاب کے محاسن نیز اس کی ادبی اور تاریخی اہمیت کو واضح کرسکیں۔محمود الٰہی صاحب نے جن کتابوں کے مقدمات قلم بند کیے ہیں، ان کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مقدمہ نگاری کے تقاضوں کو بہ طریقِ احسن پورا کیا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ فاضل مقدمہ نگار نے دورانِ مطالعہ جن نتائج کا استخراج کیا تھا، ان نتائج کی بنیاد پر نئے ادبی مباحث کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ گویا یہ مقدمات زبان وادب کے مباحث کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، اور اس طرح سے تحقیق درتحقیق کی روایت کو فروغ حاصل ہوا۔

محمود الٰہی صاحب کی مقدمہ نگاری کا ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے مبحث کو ذیلی حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔اس تکنیک سے کم وبیش ضروری نکات زیر بحث آکر روشن ہوجاتے ہیں۔ مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ، جو انھوں نے اپنی بیگم کے نام لکھے تھے، اور انھیں صحیفۂ محبت یا صحیفۂ عشق کہتے تھے؛ انھی خطوط کو محمود الٰہی صاحب نے مرتب کرکے تفصیلی مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔مقدمے میں ضروری تفصیلات کا احاطہ کرتے ہوئے مہدی افادی کی نثری خصوصیات اور ان کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مہدی افادی کا وطن گورکھپور تھا۔ الٰہی صاحب نے گورکھپور کی علمی اور تہذیبی فضا کا نقشہ کھینچا، اور گورکھپور کی تہذیبی فضا میں جن اساطینِ ادب کی بدولت رنگ ونور کی بارش ہوتی تھی، اور جن کے دم قدم سے تہذیبی زندگی کا جوبن باقی تھا، ان پر روشنی ڈالی۔ مہدی افادی کے خاندان اور خود مہدی کی تعلیم وتربیت کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادبی منظرنامے پر مہدی افادی کے طلوع ہونے کا زمانہ متعین کیا ہے۔مہدی علی گڑھ تحریک سے کس حد تک متاثر تھے، شبلی اور

> مقدمہ نگاری کے باب میں اردو کے جن معدودے چند قلم کاروں کا نام لیا جاسکتا ہے، ان میں مولوی عبدالحق کا نام بہت اہم ہے۔ مولوی صاحب کی خدمات بے حد وقیع اور اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اردو کے لیے بے لوث اور ان تھک کام کیا۔مختلف سیاسی محاذوں پر وہ اردو کا دفاع بھی کرتے رہے۔
>
> ان سب کے علاوہ مولوی صاحب نے قدیم متون اور تذکروں کو نہ صرف یہ کہ تلاش کیا، بلکہ اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ ان کو شائع بھی کیا۔ ان کے طرزِ تحقیق سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ضروری نہیں کہ مولوی صاحب کے نتائج پر ہر شخص آمنا وصدقنا کہے۔ اس کے باوجود ان مقدمات وحواشی کی اہمیت مسلم ہے۔

دیگر معاصر ادیبوں سے ان کے رشتے کی نوعیت کیا تھی، اس پر بھی گفتگو کرتے ہوئے خطوط کی شخصی اور ادبی اہمیت کو روشن کیا۔ بیگم مہدی کا ذکر وہ جذباتی انداز میں کرتے ہیں، نیز ان لمحات کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں، جو مہدی افادی کے قلم سے محبت، احترام اور عشق میں ڈوبے ہوئے خطوط لکھوانے کا باعث ہوئے۔ مہدی کی خطوط نویسی کی مدت بارہ برسوں کا احاطہ کرتی ہے، لیکن ان خطوط میں محبت کا جذبہ کبھی سرد نہیں پڑا۔ وہی گرم جوشی اور پروانہ وار نثار ہوجانے کی کیفیت ان خطوط کو امتیاز عطا کرتی ہے۔محمود الٰہی کی نثر کا کمال یہ ہے کہ وہ ادبی اور سوانحی حقائق کا ذکر اس انداز واسلوب سے کرتے ہیں کہ زندگی کے حسن کے ساتھ ساتھ نثر بھی حسین تر ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر صرف یہ بات ذکر کرنی مقصود ہے کہ مہدی افادی کی قبر گورکھپور میں ان کے ذاتی مکان میں بنائی گئی ہے، اور بیگم مہدی اسی مکان میں قیام پذیر ہیں۔ اس بات کو وہ یوں رقم کرتے ہیں:

> مہدی افادی کا مزار ان کے گھر کے آنگن کے ایک گوشے میں ہے۔ میں جب مقبرے میں داخل ہوا تو مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی مجاور نے اسے زندۂ جاوید بنادیا ہے۔ روزانہ قبر پر چراغ جلانا، اپنے ہاتھ سے سفیدی کرنا، ایصالِ ثواب کرنا اور پھر اس صحیفۂ محبت کے بعض خطوط کی تلاوت کرنا؛ یہی ان کے معمولات ہیں۔ انھیں یہ خطوط زبانی یاد ہیں۔
>
> [رشحات، ص46]

اس اقتباس کی روشنی میں محمود الٰہی صاحب کی نثر کا اختصاص یہ ہے کہ اس جذباتی موقع کی عکاسی انھوں نے جس محبت اور عقیدت سے کی ہے، اور جن لفظیات کی مدد سے دل کے تاروں کو چھیڑنے کا کام لیا ہے، یہ اسلوب کم وبیش مہدی افادی کے بنیادی اسلوب کا عکس معلوم ہوتا ہے۔الٰہی صاحب کی تحریر کی آخری سطریں ہم تک یادوں سے معطر اور اشکوں میں منور ہوکر پہنچتی ہیں۔

محمود الٰہی صاحب نے مولوی کریم الدین کی تصنیف: خط تقدیر کو شائع کیا، اور ''اردو کا پہلا ناول: خط تقدیر'' کے عنوان سے جو مقدمہ تحریر کیا، اس میں اسے اردو کا اوّلین ناول قرار دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کو مرأۃ العروس کی وجہ سے اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جا چکا ہے۔ محمود الٰہی صاحب نے مولوی کریم الدین کے ناول کا تقدم ثابت کرتے ہوئے لکھا کہ نہ صرف یہ کہ خط تقدیر مرأۃ العروس سے پہلے شائع ہوا تھا، بلکہ متعدد مرتبہ شائع ہو کر قبولِ عام کی سند بھی حاصل کر چکا تھا۔ اس طرح محمود الٰہی صاحب نے ایک مسلمہ حقیقت کے سامنے 'خط تقدیر' کو بڑے اعتماد اور دلائل کے ساتھ رکھا، اور اس طرح ایک نئی بحث کو آگے بڑھا کر ادبی تحقیق کی روایت کو مزید مستحکم کیا۔

پیش نظر مقدمے میں بھی محمود الٰہی صاحب نے ذیلی نکات قائم کرتے ہوئے ان پر اپنی گفتگو کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ اولاً مولوی کریم الدین کے سالِ پیدائش سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے درست سال کا تعین کرتے ہیں، نیز اس کے پس منظر کے طور پر دہلی کالج کی ادبی اور تہذیبی فضا کا ذکر کرتے ہیں، اور اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ کس طرح دہلی کالج اپنے مقاصد کی تکمیل کی سمت میں مثبت انداز سے پیش قدمی کر رہا تھا۔ مولوی کریم الدین بھی دہلی کالج کے فیض یافتہ تھے۔ الٰہی صاحب دورِ طالب العلمی کے دوران اور پھر بہ حیثیت مترجم کالج سے مولوی کریم الدین کے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد کریم الدین نے اپنا پریس کیسے قائم کیا، انھوں نے اپنے مکان پر دہلی کے شعرا وعمائدین کے مشاعرے کس طرح برپا کیے؛ ان سب پر ڈاکٹر الٰہی نے محققانہ انداز میں بھرپور اشارے کیے ہیں، جس سے اس دور کی تہذیب آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ سب سے اخیر میں انھوں نے خط تقدیر اور مرأۃ العروس کے تقدمِ زمانی پر بحث کرتے ہوئے خط تقدیر کے موضوع، کردار اور تکنیک کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ محمود الٰہی صاحب جہاں مولوی کریم الدین کو پہلا ناول نگار تسلیم کرتے ہیں، وہیں ان کے ناول میں متعدد مقامات پر اسقام کی نشان دہی بھی کرتے ہیں:

> ''ان کی زبان میں کوئی خاص دل کشی نہیں۔ ......نذیر احمد ایک بڑے فن کار تھے۔ زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ ......کریم الدین کا فن اس خصوصیت سے عاری تھا، لیکن اس کے باوصف انھوں نے اردو قصے کو بعض ایسی قدریں دیں جہاں تک نذیر احمد کی رسائی نہیں ہو سکی۔''
>
> [رشحات، ص 71]

محمود الٰہی صاحب نے میرؔ کا تذکرۂ نکات الشعرا شائع کیا اور اس پر بھی ایک تفصیلی مقدمہ قلم بند کیا۔ یہ مقدمہ ان معنوں میں یادگار حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں مرتب موصوف نے میرؔ کی تذکرہ نگاری کے طریقِ کار سے تفصیلی بحث کی ہے۔ تمہیدی کلمات کے بعد وہ نکات الشعرا، تذکرۂ ریختہ گویاں اور مخزنِ نکات کی تالیف کا ذکر کرتے ہوئے تقدمِ زمانی کا شرف نکات الشعرا کو دیتے تو ہیں، لیکن ساری بحث کو دونوں تذکروں (نکات الشعرا اور تذکرۂ ریختہ گویاں) کے اسبابِ تصنیف پر مرتکز کر دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں تقدمِ زمانی کے بمقابل اصل اہمیت اس طرزِ فکر کی ہے، مذکورہ تذکرے جس کے عمل و ردِ عمل کے مظاہر ہیں۔

مقدمے میں محمود الٰہی صاحب نے میرؔ کے ترکِ اکبرآباد کرنے اور دہلی کو مستقل وطن بنا لینے کا ذکر کیا ہے۔ دہلی میں خانِ آرزو اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے تلامذہ کے مابین معاصرانہ چشمک اور رقابتِ باہمی کا بھی بیان کرتے ہیں، نیز اس کو دونوں تذکروں کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب قرار دیتے ہیں۔ گویا میرؔ اور گردیزی کے تذکروں کا تجزیہ دہلی کے شاعروں کی رقابت اور معاصرانہ چشمک کے پس منظر میں ہی کیا جائے تو درست نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ میرؔ کا تذکرہ جانب داری اور تعصب کی منہ بولتی تصویر ہے، اس کے مقابلے میں گردیزی نے نسبتاً زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن تقدیر کی نیرنگی کا تماشا دیکھیے کہ قبولِ عام کی سند میرؔ کے تذکرے کو حاصل ہوئی۔ بہ قولِ محمود الٰہی:

> اور پھر نکات الشعرا میں تو میرؔ کی شخصیت بھرپور طریقے سے جلوہ گر ہوئی ہے، اس لیے اس کے مطالعے کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ یہ دراصل دوسرے شاعروں کا تذکرہ کم اور خود میرؔ کا تذکرہ زیادہ ہے۔
>
> [رشحات، ص 79]

فسانۂ عجائب اردو کی نثری تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ آج اس کی زبان ہمیں مشکل، پیچیدہ، پر تکلف اور از کار رفتہ معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب اس کی یکتائی کی دھوم مچ گئی تھی، اور اس کا اسلوب معیار ساز ثابت ہوا تھا۔ ایک مدت تک اس اسلوب نے دلوں پر حکمرانی کی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا تھا کہ دہلی کی معیاری زبان اور

اسلوب کے مقابلے میں اس کتاب نے ایک نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی، اور دہلی کی مرکزیت کو چیلنج کیا۔

فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرورؔ کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوئی تھی۔ البتہ مصنف نے پانچ نسخوں پر باقاعدہ نظرِ ثانی کی تھی۔ پہلا ایڈیشن سنہ 1259ھ میں میر حسن رضوی کے مطبع سے شائع ہوا تھا، اور آخری نسخہ مولوی محمد یعقوب انصاری نے سنہ 1280ھ میں اپنے مطبع افضل المطابع میں چھاپا تھا۔

[دیگر تفصیلات فسانۂ عجائب مرتبۂ رشید حسن خاں میں موجود ہیں]

محمود الٰہی صاحب یہاں بھی اس مسلّمے سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ فسانۂ عجائب ایک نئے اسلوب کے پیرہن میں ایک نئی تہذیب کی علامت کے طور پر شناخت قائم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ محمود الٰہی صاحب نے 'فسانۂ عجائب کا بنیادی متن' کے نام سے اس کی ایک روایت شائع کی ہے، جس کے مقدمے میں وہ فسانۂ عجائب کے موجودہ اسلوب اور اس کے پس منظر کی نفی کرتے ہوئے ایک نئی حقیقت آشکار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ سرورؔ نے فسانۂ عجائب میں جو نثر پیش کی ہے، وہ ان کی اپنی نثر نہیں ہے۔ وہ ان کی ایسی نثر ہے جس میں ان کی ضمیر کی آواز شامل نہیں ہے۔ فسانۂ عجائب کی نثر سراسر اکتسابی ہے۔ انھوں نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر فسانۂ عجائب کو مسجع نثر کا نمونہ بنا کر پیش کیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سرورؔ ایک سچے اور کھرے نثر نگار تھے، اور ان کی نثر اردو نثر نگاری کے ارتقا کی ایک فطری مگر اہم کڑی ہے۔''

[رشحات، ص 98]

محمود الٰہی صاحب نے اس بنیادی متن سے جن نتائج کا استخراج کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورؔ نے اوّلاً صرف ایک قصہ قلم بند کیا تھا۔ بعد میں جب اسے قبول عام ملنے لگا اور قلم کاروں میں ان کا شمار ہونے لگا تو وقت کے دھارے اور سیاست کے رخ کا اندازہ کرتے ہوئے انھوں نے ایک نئے اسلوب میں خود کو جلوہ گر کیا، اپنی شناخت قائم کی، اور کامیاب بھی ہوئے۔ بقول محمود الٰہی:

''...... وہ نثر فسانۂ عجائب کی پہلی اشاعت (۱۲۵۹ھ) کے بعد ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی، اور اس وقت سے آج تک دنیا سرورؔ کی ایسی نثر سے دوچار ہے، جس پر آورد اور تکلف کے ہزار پردے پڑے ہوئے ہیں۔''

[رشحات، ص 98]

''فسانۂ عجائب کا بنیادی متن'' سے محمود الٰہی صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ متداول فسانۂ عجائب کا اسلوب سرورؔ کا بنیادی اور فطری اسلوب نہیں ہے، بلکہ وہ قبولِ عام اور لکھنؤ کے ادبی امتیازات کا زائیدہ ہے۔ محمود الٰہی صاحب کے اس اقدام کا اثر اس صورت میں ظہور پذیر ہوا کہ سید حنیف نقوی نے اس سے متعلق ایک مفصل مضمون لکھا اور بعض حقائق کی روشنی میں ایک نیا مسلمہ قائم کرنے کی راہ ہموار کی۔ رشید حسن خاں کا یہ اقتباس محمود الٰہی کی اس کوشش کا برملا اعتراف ہے:

''......پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرۂ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ ...... ہاں الگ سے یہ کام کرنے کا ضرور ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو میرا ارادہ بھی ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ تحریر کروں۔ البتہ یہ صراحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نقوی صاحب کے اس خیال سے پوری طرح متفق نہیں کہ اسے کسی داستان گو نے از سرِ نو تحریر کیا ہے۔

[فسانۂ عجائب، ص 102]

محمود الٰہی صاحب کا ایک اہم کارنامہ تذکرۂ شورش کی دریافت اور اس کی اشاعت ہے۔ موصوف کو یہ نسخہ خانقاہِ رشیدیہ جون پور کے متولی ہاشم علی کے توسط سے ہاتھ لگا تھا۔ اس تذکرے کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔ یہ تذکرہ ان معنوں میں نادر ہے کہ سرزمین بہار پر لکھا جانے والا یہ اولین تذکرہ ہے۔ بہار میں اردو شاعری کی سمت و رفتار کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

محمود الٰہی صاحب نے نہ صرف اس پر تفصیلی مقدمہ لکھا بلکہ بہار میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقا کی داستان کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔ یہ بات تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے کہ عام طور سے تذکروں کی تالیف کی پشت پر مثبت اندازِ فکر کے ساتھ ساتھ بعض اوقات معاصرانہ چشمک اور دبستانی رقابت کے منفی رجحانات بھی کارفرما رہتے تھے۔ میرؔ کا نکات الشعرا اور گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں انھی جذبات کی عملی تصویر ہیں۔ تذکرۂ شورش کے مصنف بھی معاصرانہ چشمک کے رویے کا شکار ہوئے تھے۔

مرتب موصوف نے مقدمے میں تذکرۂ

شورش کے سالِ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے اسے سنہ 1191ھ کی تالیف بتایا ہے، اور اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ آکسفورڈ میں اس تذکرے کا جونسخہ محفوظ ہے، وہ تحریف کا شکار ہوا ہے۔ موصوف سے قبل قاضی عبدالودود صاحب نے بھی مذکورہ تذکرے میں تصرف کا اشارہ دیا تھا، لیکن اس نسخے کی دریافت سے تحریف کی بات حتمی طور سے سامنے آگئی۔ مرتب نے جہاں تذکرۂ شورش کے پس منظر کا ذکر کیا ہے، وہیں بہار میں سیاسی طور سے جو خلفشار پیدا ہورہا تھا، اس کی بھی تفصیل بیان کردی ہے، جس سے تذکرے کا پس منظر مزید روشن اور واضح تر ہوگیا ہے۔

شورش کے اس تذکرے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کی مدد سے بہار میں اردوشاعری کے رواج پذیر ہونے کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے۔ باقرحزیں پہلے شخص تھے، جنھوں نے بہار میں اردو شاعری کی ترویج واشاعت کا کارنامہ انجام دیا۔ اس سے پہلے وہ دہلی میں مرزا مظہر جانِ جاناں کی شاگردی سے فیض یاب ہوچکے تھے۔ شورش کو شاہ رکن الدین عشق سے تقرب حاصل تھا، اور انھی کی ایما پر شورش نے یہ تذکرہ تالیف کیا تھا۔ یہ دونوں اساتذہ مرزا جانِ جاناں کے تربیت یافتہ تھے، اس طرح سے بہار کی اردو شاعری پر ابتدا میں مرزا جانِ جاناں کے تلامذہ کے اثرات نمایاں طور سے نظر آتے ہیں؛ یہ بات ہمیں اسی مقدمے سے معلوم ہوتی ہے۔ تذکرۂ شورش اس لحاظ سے بھی تاریخی حیثیت کا حامل ہے کہ یہ عظیم آباد کے شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔

اس تذکرے کی مدد سے بہار کے بیش تر شعرا کے حالات گمنامی کے پردے سے باہر آتے ہیں، لیکن شورش کے حالاتِ زندگی کے بارے میں یہ تذکرہ چند اشاروں کے سوا کوئی قابل ذکر رہنمائی نہیں کرپاتا۔ پھر بھی اس سے شورش کے بعض سوانحی نکات اور شاعرانہ اہمیت کے پہلو روشن ضرور ہوتے ہیں۔

محمود الٰہی صاحب نے ایک تفصیلی مقدمہ الہلال والبلاغ کے لیے تحریر کیا تھا۔ آزاد صدسالہ تقریب کے موقع پر الہلال والبلاغ کی مکمل فائلیں تین جلدوں میں شائع کی گئی تھیں، یہ مقدمہ اسی مجموعے کا حصہ ہے۔ یوں تو محمود الٰہی صاحب نے جتنے بھی مقدمات قلم بند کیے ہیں، وہ پوری محنت، دیانت داری اور خلوص سے لکھے گئے ہیں۔ لیکن الہلال کے مقدمے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سے وہ اس حد تک والہانہ عقیدت رکھتے تھے کہ مقدمے کا اسلوب مولانا آزاد کے اسلوبِ نگارش کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

انہوں نے یہ مقدمہ آزاد کے رنگ میں ڈوب کر لکھا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ آزاد احتسابی کے بجائے آزاد پرستی کی حدود میں داخل ہوگئے ہیں۔ مقدمے میں مولانا کی ذہنی تربیت، اندازِ فکرونظر، سیاسی اور مذہبی موقف، نیز ان کے مستقبل کے لائحۂ عمل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان مالی دشواریوں نیز دیگر آزمائشوں کی روداد بھی ضبطِ تحریر میں آگئی ہے، جن سے مولانا آزاد اس دوران دوچار تھے، اور جس کا اظہار انھوں نے دبی زبان میں کیا بھی تھا۔ محمود الٰہی صاحب نے الہلال کی کامیابی اور اس کے اثرات کا بہت تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے، اور یہ تاثر دینے میں کامیاب رہے ہیں کہ یہ رسالہ قومِ مسلم کی بیداری میں موثر کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کے اندر قومی اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے میں بھی بہت فعال اور متحرک تھا، نیز مولانا آزاد کی مذہبی، سیاسی اور علمی شخصیت کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کررہا تھا۔

غرض یہ کہ محمود الٰہی صاحب نے مختلف تذکروں، کلاسیکی کتابوں اور رسالوں کے جو مقدمات تحریر کیے، وہ بہ صد خلوص و احترام دیکھے گئے۔ انھیں بہت سنجیدگی سے پڑھا گیا۔ اور اس مضمون کی ابتدا جو معروضہ زیر بحث آیا ہے کہ محمود الٰہی صاحب کے مقدمات نے نئی حقیقتوں کو روشن کیا، نیز نئے نئے مباحث کے دروازے وا کیے، اس کا اعادہ تحصیل حاصل نہیں ہوگا۔ خط تقدیر خواہ تاریخی طور سے اردو کا اولین ناول تسلیم نہ بھی کیا جائے، اس سے اس تالیف کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ فسانۂ عجائب کا بنیادی متن یقیناً ایک نئے مبحث کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ نکات الشعرا اور تذکرۂ شورش کی بدولت نئے نئے گوشے منور ہوئے، نیز اردو شاعری اور تذکرہ نگاری کی روایت کو استحکام حاصل ہوا، جس کی وجہ سے زبان وادب کی تاریخ میں نئے نکات سامنے آسکے۔ اگر مقدمہ نگاری کا بنیادی وصف یہ ہے کہ زیر نظر تصنیف کی اہمیت واضح اور روشن، اس کی تاریخی حیثیت مستحکم، نیز تاریخ ادب میں اس تصنیف کے مقام ومرتبے کا تعین ہوسکے تو محمود الٰہی صاحب کے مقدمات بلاشبہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

❑❑❑

تحقیق کے رمز شناس؛ پروفیسر محمود الٰہی

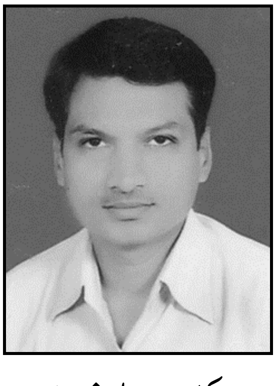

ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری

مولوی فیض اللہ مارگ

حریر پورہ، برہان پور

رابطہ: 9753210869

استادالاساتذہ پروفیسر محمود الٰہی کا شمار سربرآوردہ ادبی شخصیات میں ہوتا ہے، وہ درس وتدریس کے مقدس پیشے سے منسلک رہے۔ انتظامی صلاحیتیں بھی آپ میں بدرجۂ اتم موجود رہی ہیں۔ اس کا اظہار اس وقت خاص طور پر ہوا جب آپ یو پی اردو اکادمی کے چیئرمین تھے۔ اس دوران موصوف نے متعدد مجموعہ ہائے کلام، تذکرے اور قدیم ادبی کتابوں کو شائع کروایا۔ اکادمی کے دوماہی رسالہ 'اکادمی' کی ادارت بھی کی۔ آپ تحقیق وتنقید میں یکساں دسترس رکھتے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شعروادب کی جملہ اصناف پر آپ کو گفتگو کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ سنجیدہ طور پر تحقیقی کام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے اردو کے قدیم وکلاسیکی متون بھی درست کرکے شائع کروائے۔ یوں ترتیبِ متن اور تدوینِ کلام کے میدان میں بھی اپنا منفرد مقام بنایا۔ شائقینِ ادب، طلباء اور محققین کے ذوقِ مطالعہ کی خاطر کئی ادبی شاہکاروں کو ترتیب دے کر ان کا معیاری متن شائع کیا۔ اس ذیل میں صحیفۂ محبت، خطِ تقدیر، طبقات شعرائے ہند، نکات الشعراء، فسانۂ عجائب کا بنیادی متن، تذکرۂ شورش اور 'الہلال' وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ کتابی شکل میں ان کی اشاعت اور ان پر لکھے گئے تحقیقی و تنقیدی مقدمے موصوف کے اعلیٰ ادبی ذوق کے غماز ہیں۔ لیکن جس قابلِ قدر تصنیف کی بدولت انہیں طویل مدت تک یاد رکھا جائے گا وہ 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' ہے۔

'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' محمود الٰہی کی زبردست اہمیت کی حامل تصنیف ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی نگرانی میں لکھے اس گراں قدر تحقیقی مقالہ سے موصوف کو بہت شہرت ملی، اس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۵۷ء میں پی ایچ۔ ڈی کی سند تفویض کی، جب کہ کئی برس بعد یہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ یہ اگر چہ تنقیدی جائزہ ہے، مگر ہے تو تحقیقی مقالہ۔ یہ صنفِ قصیدہ پر بنیادی کام کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں قصیدہ کی صنفی حیثیت اور اہمیت پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ قصیدہ کے معنی ومفہوم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی زبانوں میں اس کے مقام اور مرتبہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ قصیدہ کی عروضی ترکیب اور ماہیت پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ دکن و شمال میں اردو قصیدہ کی ابتدا و ارتقا کا حال تحقیقی

انداز میں رقم کیا گیا ہے۔قصیدوں کے تنقیدی جائزے کی خاطر بعض ایسے قصیدے بھی منظرِ عام پر آ گئے ہیں جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔اپنی اس قابلِ ذکر تصنیف میں محمود الٰہی نے جن اہم نکات کی بازیافت کی اُن میں سے چند ایک اُنہیں کی زبانی ملاحظہ کریں:

۱۔ دکن میں قصیدہ نگاری کی ابتدا قطب شاہی دور اور عادل شاہی دور میں ہو چکی تھی ۔ اس دور کے قصیدوں کی یہ خصوصیت قابلِ لحاظ ہے کہ ان سے واقعہ نگاری کا کام لیا گیا ہے اور بے جا مبالغہ اور تصنع و تکلف سے انہیں الگ رکھا گیا ہے۔ ا؎

۲۔ بعض قصیدوں کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شمالی ہند میں قصیدہ نگاری کا وجود بالکل ابتدائی دور میں بھی تھا۔ ۲؎

۳۔ حاتم کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ انہوں نے قصیدے نہیں کہے۔ ان کے 'دیوان زادہ' میں ایسی نظمیں ہیں جنہیں بجا طور پر قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ ۳؎

مختصر یہ کہ صنفِ قصیدہ پر اسے اولین تفصیلی کام کا درجہ حاصل ہے۔تحقیق و تنقید کے ذیل میں جہاں اس تصنیف کی بڑی اہمیت ہے وہیں طلباء و اساتذہ کے ساتھ ساتھ محققین و نقاد بھی اس سے یکساں فیضیاب ہو رہے ہیں۔

اپنے ادبی سفر کی ابتدا سے ہی محمود الٰہی شہ پاروں کی تلاش میں منہمک رہے۔ جو نسخہ دستیاب ہوتا اس کی اہمیت، قدر و قیمت، تعارف اور مطالعہ و تجزیہ کو مضمون کی شکل میں قلم بند کر لیتے۔نسخہ کی باریکی سے چھان بین کرتے، دیگر مقامات پر موجود نسخوں کا پتہ لگاتے اور اُن سب کا مطالعہ کر کے آپس میں ان کا موازنہ کر کے نسخوں کے باہمی فرق اور اس کی قدامت وغیرہ پر پوری معلومات بہم پہنچاتے، اور معتبر ترین متن کی نشاندہی فرماتے۔قدیم مخطوطات، متون اور دواوین کو تلاش کر کے عوام میں انہیں متعارف کرانا محمود الٰہی کی ترجیحات میں شامل رہا ہے۔ اسی لیے جہاں کہیں انہیں کوئی نایاب اور کمیاب نسخہ دستیاب ہوتا، وہ اس کی پوری تحقیق کر کے عوام کو اس کی تفصیل سے آگاہ کرتے، اس سلسلے میں ان کے کئی مقالے شائع ہوئے ، جو 'بازیافت' اور 'سفینۂ نقد' میں شامل ہیں۔محمود الٰہی نے کچھ عمدہ انتخابات بھی طبع کروائے جن سے طلباء کی نصابی ضرورتوں اور قارئین کے ادبی ذوق کی تشفی ہوئی۔ان میں مشاعرۂ زنداں، انتخابِ نثر، منتخب غزلیں، انتخاب تذکرہ اور انتخاب ہفتہ وار پیغام وغیرہ ہیں۔

محمود الٰہی کے بقول انہوں نے ۱۹۵۵ء سے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھا۔ غالباً اس کے بعد ہی ان کی تحریریں شائع ہونے لگیں۔ ۱۹۶۵ء میں دو کتابیں منظرِ عام پر آئیں، ایک مضامین و مقالات کا مجموعہ 'بازیافت' اور دوسری مولوی کریم الدین کا ناول 'اردو کا پہلا ناول: خطِ تقدیر' ۔آخر الذکر کو محمود الٰہی نے مرتب کر کے شائع کروایا۔'بازیافت' کل دس تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، جن کے عنوانات ہیں؛ اردو میں جدید تحقیق کا آغاز، طبقات شعرائے ہند، اردو ڈرامہ اور انارکلی، مشرقی اتر پردیش کا ایک اہم اخبار، ناسخ کا دیوانِ دوم، شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک اور نثری کارنامہ، تذکرہ بہادر سنگھ، اردو میں عربی شعرا کا پہلا تذکرہ، مقدمۂ شورش اور احتشام حسین بحیثیت نقاد۔ان میں دو مضامین ('اردو ڈرامہ اور انارکلی' اور 'احتشام حسین بحیثیت نقاد') ایسے ہیں جن میں تنقیدی اندازِ نظر ہے، بقیہ آٹھ مضامین تحقیقی ہیں۔محمود الٰہی کے تحقیقی مضامین میں تنقیدی نقطۂ نظر شامل ہے، اسی طرح تنقیدی مضامین میں اُن کے تحقیقی ذہن کی جودت دکھائی دیتی ہے۔یعنی وہ تحقیق و تنقید کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔اس ضمن میں انہوں نے ایک جگہ لکھا بھی ہے:

''میں نے اکثر تحقیق و تنقید کو لازم و ملزوم گردانا ہے اور ایسا کرتے وقت میرے سامنے ان الفاظ کی بے پناہ معنویت رہتی ہے، اگر تحقیق نام ہے تلاش حق کا تو کیا یہ تلاش تنقیدی صلاحیت کے بغیر ممکن ہے۔اگر ہمیں ادبی تاریخ کے اوراق کو مرتب کرنا ہے تو کیا ترتیب کا یہ کام وہ انجام دے سکتا ہے جو قوتِ نقد سے محروم ہے، اگر کسی کو میر و غالب کا شاعری کی تاریخ میں مقام متعین کرنا ہے تو اسے تلاش و تفحص کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، شاعری کے محرکات کا پتہ لگانا اور اس کے پس منظر سے بحث کرنا جہاں ایک طرف قوتِ تنقید کا متقاضی ہے تو دوسری طرف تحقیقی صلاحیت بھی اس کی بنیادی شرط مانی جائے گی۔

دراصل ہم سہل پسندی کے شکار ہو گئے ہیں اسی لیے اپنی علمی بے مائیگی پر پردہ ڈالنے کے لیے ہم تحقیق کو تنقید سے جدا کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں، اسی طرح جو خطی نسخوں پر کام کرتے ہیں وہ فکر و نظر کو اپنے دائرے سے باہر نکال دیتے ہیں اسی کو افراط و تفریط یا عدم توازن کہتے ہیں۔جنہیں مشرقی علم و ادب سے دلچسپی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محقق کا لفظ

قدیم زمانے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس لفظ کا اطلاق عظیم علمی شخصیتوں پر کیا جاتا تھا۔'' ۴؎

محمود الٰہی کی لکھی ہوئی تنقیدیں ہوں، تبصرے ہوں یا اداریے، سبھی میں انہوں نے مبادیاتِ تحقیق کو ملحوظِ خاطر رکھا، بلکہ جدید اور سائنٹفک اصولِ تحقیق کی ہمیشہ پاسداری کی۔ قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب ،رشید حسن خاں اور حنیف نقوی جیسے جید مشاہیرِ تحقیق کی موجودگی میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی اور اپنے ان معاصرین کی طرح ہمیشہ اپنے کام سے منصبِ تحقیق کو وقار بخشا۔ حالاں کہ اس وقت اردو میں مبادیاتِ تحقیق پر خاطر خواہ کتابیں موجود نہ تھیں، جس سے رہنمائی حاصل کر کے کوئی طالب علم درسِ تحقیق لے سکے اور اس کی روشنی میں اپنی راہ متعین کر سکے۔ اس کے باوجود اپنے مطالعہ اور تحقیقی تجربات و مشاہدہ کی بنا پر موصوف نے صنفِ تحقیق سے متعلق چند ایسے مضامین بھی قلم بند کیے جس میں اس موضوع پر وافر معلومات پیش کیں۔ علاوہ ازیں اپنے مضامین و مقالات میں جستہ جستہ تحقیق کی دشوار گزاریوں اور اس کے اصول وضوابط وغیرہ سے متعلق گراں قدر مشورے قلم بند کیے۔ محققین کی لغزشوں کی طرف اشارہ کیا اور ان کے تدارک کی راہ بھی بتائی۔ محمود الٰہی کی ان خامہ فرسائیوں سے بخوبی تحقیق کے طریقۂ کار مرتب کیے جا سکتے ہیں جس کی روشنی میں تحقیق کے طلباء تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان اظہارِ خیالات سے محمود الٰہی کے نظریۂ تحقیق کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جو محمود الٰہی کی تحریروں سے ماخوذ ہیں:

''ہمارے یہاں تحقیق حادثات اور اتفاقات کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے، آپ کہیں چلے جا رہے ہیں، اتفاق سے آپ کا پاؤں ایک کاسۂ سر پر آ گیا، آپ نے اسے ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ فلاں شاعر کا ہے، آپ نے اس حادثے کا اعلان کر دیا اور آپ محقق ہو گئے۔'' ۵؎

''ابھی ہماری تحقیق کو اور بھی سنجیدہ ہونا چاہیے اور اسے جرأتِ اظہار اور اعترافِ حقیقت سے اور بھی زیادہ قریب ہونا ہے۔'' ۶؎

محمود الٰہی کی لکھی ہوئی تنقیدیں ہوں، تبصرے ہوں یا اداریے، سبھی میں انہوں نے مبادیاتِ تحقیق کو ملحوظِ خاطر رکھا، بلکہ جدید اور سائنٹفک اصولِ تحقیق کی ہمیشہ پاسداری کی۔

قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، رشید حسن خاں اور حنیف نقوی جیسے جید مشاہیرِ تحقیق کی موجودگی میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی اور اپنے ان معاصرین کی طرح ہمیشہ اپنے کام سے منصبِ تحقیق کو وقار بخشا۔

حالانکہ اس وقت اردو میں مبادیاتِ تحقیق پر خاطر خواہ کتابیں موجود نہ تھیں، جس سے رہنمائی حاصل کر کے کوئی طالب علم درسِ تحقیق لے سکے اور اس کی روشنی میں اپنی راہ متعین کر سکے۔

''میں نے ایک بار کہا تھا کہ ابھی ہماری تحقیق نے باہمی تعاون کی بنیاد پر آگے بڑھنا نہیں سیکھا ہے اور موجودہ صورتِ حال اس وقت تک رہے گی جب تک ہم تحقیق کو ایک پراسرار چیز بنانے پر اصرار کرتے رہیں گے۔'' ۷؎

''میں نے ۱۹۵۵ء میں تحقیق کی دنیا میں قدم رکھا اور اسی وقت سے میری یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے مالہ و ماعلیہ کا مطالعہ کر لیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی موضوع پر اگر کچھ کہا جا چکا ہے تو یا اس پر اضافہ کر دوں یا اس کی تردید کروں ورنہ خاموش ہو جاؤں، دوسروں کی تعمیر اپناتے ہوئے مجھے حجاب آتا ہے۔'' ۸؎

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ جا بجا محمود الٰہی نے اپنی تحریر میں تحقیق کی صورتِ حال ، سروکار، مقاصد اور ایک محقق کے اوصاف وغیرہ سے متعلق کھلے لفظوں میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ سرسید کے بعض رفقاء کے حوالے سے لکھے اپنے مضمون 'اردو میں جدید تحقیق کا آغاز' میں جہاں سرسید احمد خاں کی تحقیقی خدمات کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے وہیں ان کے اہم رفقاء مثلاً الطاف حسین حالی، مولوی چراغ علی اور محسن الملک وغیرہ کے ذوقِ تحقیق کی داد دی ہے۔ سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید کے دونوں ایڈیشنوں کی اشاعت کے دوران جو دیگر مضامین اور تصانیف شائع ہوئیں، اس مدت میں کس طرح سرسید کا تحقیقی شعور پختہ ہوتا گیا اور کس طرح وہ میدانِ تحقیق کے ہفت خواں طے کرتے گئے، اس پر غالباً پہلے پہل محمود الٰہی نے ہی توجہ دی۔ موصوف نے اپنے اس مقالہ کے ذریعے اردو تحقیق کی ابتدا و ارتقا اور اس عہد کے ادبی امتیازات کے جائزے کے ساتھ ساتھ اس میں بحیثیت محقق سرسید کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے، نیز تحقیق کی سمت و

رفتار کا بڑے عمدہ اور جامع انداز سے نقشہ پیش کیا ہے۔محمود الٰہی کا یہ مضمون اُن کے مجموعہ مضامین ’بازیافت‘ میں شامل ہے۔اِس دور تک اردو میں شاعری،افسانہ نگاری اور زبان و ادب کی تاریخ نویسی پر تو خاطر خواہ توجہ دی گئی،بہت سے عمدہ مضامین اور تصانیف بھی منظرِ عام پر آئے،مگر اردو تحقیق کی روایت اور تحقیقی سرمائے پر غالباً اس دلچسپ انداز سے نہیں لکھا گیا تھا۔مضمون اگرچہ سرسید اور ان کے چند رفقاء کی تحقیقی کاوشات کے تذکرے تک ہی محدود ہے اور اس میں تمام رفقائے سرسید پر اظہارِ خیال نہیں کیا گیا ہے۔جب کہ اس حلقہ میں اور بھی لوگ تھے جو اپنی اپنی تحریروں میں تحقیقی انداز اپنائے ہوئے تھے۔

بہر حال مذکورہ مضمون میں بطورِ خاص سرسید احمد خاں کی تلاش و تحقیق کا آثار الصنادید سے لے کر آئینِ اکبری،تبیین الکلام،خطباتِ احمدیہ،تفسیر القرآن اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ تک کا تجزیہ کیا گیا ہے۔سرسید نے کس طرح قدیم مخطوطات و مصادر تک رسائی حاصل کر کے شواہد جمع کیے،اور ان کی روشنی میں نتائج پیش کیے،ان سب کا محققانہ نظر سے جائزہ لے کر محمود الٰہی نے جو نتائج پیش کیے ہیں وہ قابلِ غور بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔اس طرح تحقیق کے فروغ میں سرسید نے جو رول ادا کیا ہے اس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔اس ضمن میں محمود الٰہی کا یہ کہنا حق بجانب ہوگا،جو ان کے اس مضمون کا لب لباب بھی ہے:

’’ تبیین الکلام سے لے کر تفسیر القرآن تک سرسید نے تحقیق کے اس حصے کو اپنایا جو تخلیق کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔تقلید اور روایت پرستی کی گرفت سے آزاد ہونا، ماخذ کی چھان بین کر کے حقائق کا دریافت کرنا،مسلمات کی نئی تعبیر اور اس کی بنیاد پر روشن مستقبل کی تاسیس سرسید کی مذہبی تحقیقات کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ ساری باتیں اس ماحول کے لیے نئی تھیں جہاں عربی کا احترام کیا جاتا تھا، فارسی کی قدر و قیمت کا اندازہ تھا اور اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی ۔ یہ باتیں سرسید کو متکلمینِ اسلام کے علم ، عقائد اور مغرب کے جدید اصولِ تحقیق کے امتزاج کے نتیجے میں ملی تھیں جن سے ان کے معاصرین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔‘‘ ۹

الغرض محمود الٰہی نے آثار الصنادید کے دونوں ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ بڑے معروضی انداز سے پیش کیا ہے۔جدید اصولِ تحقیق کی رو سے پہلے ایڈیشن میں جہاں کمیوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہیں دوسرے ایڈیشن میں کس طرح سرسید نے اصولِ تحقیق پر اپنی گرفت مضبوط کر کے نکھار لایا ہے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے، یعنی سرسید کے تحقیقی شعور نے کس طرح بتدریج ارتقا کی منزلیں طے کی یہ واضح کیا گیا ہے۔اس ضمن میں محمود الٰہی رقم طراز ہیں:

’’ آثار الصنادید‘ سے ’آئینِ اکبری‘ تک کا فاصلہ کوئی زیادہ طویل نہیں ہے لیکن سرسید کے تحقیقی شعور پر جذباتیت اور افسانویت کا پردہ پڑا ہوا تھا تو آئینِ اکبری تک آتے آتے ان کی رگوں میں تلاش و تفحص خون بن کر دوڑنے لگا تھا۔آئینِ اکبری میں سرسید ایک مغربی محقق کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ان کا موضوعِ تحقیق مشرقی تھا لیکن انداز و آداب مغربی،اب وہ مسائل کی تہوں تک پہنچنے کا ڈھنگ جان گئے تھے۔۔۔

اب وہ دنیائے تحقیق کے آشنائے راز ہو چکے تھے۔‘‘ ۱۰

تذکروں کی ترتیب و تدوین سے بھی محمود الٰہی کو خاص شغف رہا ہے،اسی لیے تذکروں سے متعلق ان کی کاوشات گاہے گاہے منظرِ عام پر آتی رہی۔تذکرے متعدد اصنافِ ادب کا نقطۂ آغاز ہیں،تنقید،تحقیق،سوانح،تبصرہ نگاری وغیرہ کی ابتدا انہیں تذکروں سے ہوئی۔اردو زبان و ادب اور شاعری کی ابتدا ، آغاز وارتقاء اور ارتقائی سفر کا خاطر خواہ احوال ان تذکروں کے توسط سے ہی ہم تک پہنچا ہے۔اس طرح تذکرے ہمارے ادب کا ابتدائی اور قیمتی سرمایہ ہیں۔پچھلے زمانے کے شعر و ادب، شعرا و ادبا اور ان سے متعلق بے شمار معلومات کا ذخیرہ ان تذکروں میں محفوظ ہے۔لہٰذا کسی بھی اعتبار سے تذکروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔مشاہیر نے ہمارے قدیم تذکروں کے ذریعے ہی بعض گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کی اور واقعات و تاریخ میں درست ترتیب کی نشاندہی کی، اسی کے ذریعہ قدما کے تحقیقی و تنقیدی اذہان کا پتہ بھی چلا ۔تذکروں کے عمیق مطالعے سے متعدد پرانے مسلمات رد ہوئے اور نئے حقائق سے واقفیت حاصل ہوئی ۔ یوں نہ صرف تاریخ شعر و ادب میں خوش گوار اضافے ہوئے بلکہ زیادہ صحیح اور معتبر امور و حقائق سامنے آئے۔یہ سب کچھ عمیق تحقیقی بصیرت کے بغیر ممکن نہ تھا۔اس سمت میں محمود الٰہی نے کئی راز افشا کیے۔تذکروں کی تحقیق سے متعلق موصوف کے اہم کام طبقات شعرائے ہند ،نکات الشعرا اور تذکرۂ شورش ہے۔ ان

تذکروں کو تلاش و تحقیق کے بعد بڑی عرق ریزی سے متعلقات کی روشنی میں تفہیم و تجزیہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے، اور تدوینِ متن کے جدید مبادیات کی روشنی میں تصحیح کر کے اس پر نہایت جامع اور پُرمغز مقدمہ لکھ کر شائع کروایا، نیز اردو میں عربی شعرا کے پہلے تذکرہ کے طور پر 'فرائد الدہر' کو متعارف کرانا بھی محمود الٰہی کی ہی کوشش ہے۔

محمود الٰہی نے نثر لکھنے کا رواں اور شگفتہ انداز اپنایا ہے، تحقیقی مضامین میں بعض اوقات امور و حقائق کی تفہیم میں جو الجھاؤ اور پیچیدگی در آتی ہے اس سے محمود الٰہی کی نثر تقریباً محفوظ ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اکثر مقامات پر اپنے نتائج بڑے واضح اور کھلے لفظوں میں پیش کیے ہیں، دوسری خاص بات یہ کہ ادبی کمالات میں اولیات کی بھی تحقیق کی اور انہیں بطورِ خاص اجاگر کیا۔ مثلاً طبقات شعرائے ہند کے بارے میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

'تذکرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تحقیق اور حقائق کی بازیافت کے جو حسین اور کامل نمونے سرسید کے یہاں ملتے ہیں ان کی جھلک اس میں ملتی ہے، یہ نامکمل اور خام سہی لیکن بہر حال اس کا جھکاؤ تحقیق کی طرف ہے۔'' ۱۱

اسی طرح کلیاتِ سوداؔ کے تعلق سے کہتے ہیں:

''ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے جس ڈھنگ پر انیسؔ نے فخر کیا تھا دراصل اس کا موجد سوداؔ ہے۔ اگر ہم ناسخؔ، انیسؔ، دبیرؔ یا لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کے اکتسابات کا جائزہ لیں تو اس کی جڑیں کلیاتِ سوداؔ میں ملیں گی، کلیاتِ میرؔ میں نہیں۔'' ۱۲

طبقات شعرائے ہند ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس پر لکھا گیا مقدمہ جو 'بازیافت' میں بھی شامل ہے، خاصے کی چیز ہے۔ اسی طرح محمود الٰہی کے ذریعہ مرتب کی گئی تصانیف پر لکھے گئے مقدمے اور تعارفی مضامین بھی معلومات سے پُر ہیں۔ تذکروں میں 'نکات الشعراء' کی اشاعت بھی اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس پر لکھے مقدمہ میں جس انداز سے اس کے مختلف نسخوں کی روشنی میں محمود الٰہی نے اپنا مطالعہ اور مطمحِ نظر پیش کیا ہے وہ خالص تحقیقی انداز رکھتا ہے۔ تذکروں کے زمانی تقدم، میرؔ کے حالات، معاصرین، معاصر تذکرے اور عہدِ میرؔ کے ادبی مزاج و مذاق پر پیش کی گئی پوری بحث انفرادیت کی حامل ہے نیز میریات کی تفہیم میں بڑی ممد و معاون ہے۔

تذکروں کی ترتیب و تدوین سے بھی محمود الٰہی کو خاص شغف رہا ہے، اسی لیے تذکروں سے متعلق ان کی کاوشات گاہے گاہے منظرِ عام پر آتی رہی۔ تذکرے متعدد اصنافِ ادب کا نقطۂ آغاز ہیں، تنقید، تحقیق، سوانح، تبصرہ نگاری وغیرہ کی ابتدا انہیں تذکروں سے ہوئی۔ اردو زبان و ادب اور شاعری کی ابتدا، آغاز و ارتقاء اور ارتقائی سفر کا خاطر خواہ احوال ان تذکروں کے توسط سے ہی ہم تک پہنچا ہے۔ اس طرح تذکرے ہمارے ادب کا ابتدائی اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ پچھلے زمانے کے شعر و ادب، شعرا و ادبا اور ان سے متعلق بے شمار معلومات کا ذخیرہ ان تذکروں میں محفوظ ہے۔ لہٰذا کسی بھی اعتبار سے تذکروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح مضمون 'تذکرہ بہادر سنگھ' میں اس تذکرہ سے متعلق بعض نئی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ بہادر سنگھ کے 'یادگارِ بہادری' جو محض فارسی شاعروں کی تفصیل پر مشتمل تھا کا دوسرا حصہ جو دنیائے ادب کی نظروں سے اوجھل تھا کو تلاش کیا گیا، اِس کی روشنی میں محمود الٰہی نے بہادر سنگھ کی زندگی سے متعلق اہم اطلاعات پیش کیں۔ اس کا اردو حصہ ترانوے اردو شاعروں کے حالات پر مشتمل ہے جو ایک الگ مستقل تذکرہ کی حیثیت رکھتا ہے، محمود الٰہی کی کاوش سے ہی سامنے آیا۔ اس ضمن میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

اس نسخے کے مطالعے کے بعد جہاں یہ معلوم ہوا کہ کتاب کئی حیثیتوں سے مفید ہے وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اس میں فارسی شعرا کا تو ذکر ہے ہی، اس کا ایک جداگانہ باب اردو شعرا سے متعلق ہے جسے دراصل ترانوے شعرائے اردو پر مشتمل ایک تذکرے کی حیثیت حاصل ہے۔'' ۱۳؎

مولوی کریم الدین کی حیات و خدمات پر محمود الٰہی نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ کام کیا ہے۔ کریم الدین کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف سے متعلق بیش بہا نئی معلومات کی بازیافت کی، اس متعلق نہ صرف تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر کے حامل مضامین قلم بند کیے بلکہ 'طبقات شعرائے ہند' اور 'خطِ تقدیر' کی شکل میں مرتب کر کے انہیں شائع بھی کیا۔

ایک عرصہ سے ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار اور ان کے ناول 'مرأۃ العروس' کو اردو کا پہلا ناول سمجھا جاتا رہا ہے۔ اردو کے پہلے ناول کی بحث بھی ایک مدت سے چلی آ رہی تھی۔

محمود الٰہی نے کریم الدین سے متعلق اپنی تحقیقات میں اُن کے لکھے ہوئے ناول 'خطِ تقدیر' کو متعارف کروایا اور تلاش و تحقیق کے بعد ثابت کیا کہ 'خطِ تقدیر' ہی اردو کا پہلا ناول ہے۔ اگرچہ بہت سے محققین نے اسے تسلیم کرنے اور 'خطِ تقدیر' کو ناول کے طور پر قبول کرنے میں قباحت محسوس کی، اس سبب سے اس امر پر مزید تحقیق کی بات کہی۔ اس بحث سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ 'خطِ تقدیر' کی اشاعت نذیر احمد کے مراۃ العروس سے سات سال قبل کی ہے۔ اس حقیقت کے ذریعہ محمود الٰہی نے اردو ناول کی تاریخ اور ناول نگاری کی ابتدا کو سات برس اور پیچھے تک لے گئے۔ اس طرح ایک پرانی تعمیر جو مراۃ العروس پر ٹکی تھی، مسمار ہوئی، اور ادب میں ایک نئی معلومات کا اضافہ ہوا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''خطِ تقدیر سے اردو میں قصہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، ہمارے افسانوی ادب میں مغربی اقتدار کے زیرِ اثر جو تبدیلی ہوئی، اب تک کی تحقیق کے مطابق اس کا یہ اولین نمونہ ہے۔ کریم الدین محمد حسین آزاد کے بھی پیش رو تھے اور نذیر احمد کے بھی۔ ایک نے ان کے تمثیلی طرز پر جلا کی اور دوسرے نے ان کے ناول نگاری کے فن کو آگے بڑھایا۔'' ۱۴؎

خطِ تقدیر پر لکھے اپنے اس مقدمہ میں محمود الٰہی نے صنفِ ناول، قصہ گوئی کے فن اور تمثیل نگاری کی بنیادی خصوصیات پر بڑی عمدہ اور ادبی گفتگو کی ہے، وہ اپنی بات کے ثبوت میں مضبوط دلائل و براہین اور مستند حوالوں سے کام لیتے ہیں۔ حالاں کہ محمود الٰہی اپنے تمام تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات اور تحریروں میں مستند و معتبر ماخذ اور شواہد پیش کرتے ہی ہیں۔ جس کے سبب ان کی تحقیق میں اثر پذیری اور اعتبار کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

محمود الٰہی نے شعبۂ درس و تدریس میں ایک طویل عرصہ صرف کیا اس لیے اُنھیں نصاب کے تقاضوں اور طلباء کے ذہنی معیار کا بخوبی علم تھا۔ انہیں تعلیم مشغولیات کے دوران جو تجربات حاصل ہوئے اس بنا پر مفید کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ شہ پاروں کی درست قرأت اور اس کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ جس سے طلباء کی ضرورتوں کی کافی حد تک تکمیل ہوئی۔ شعراء کے کلام کے انتخاب کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ متن کا انتخاب اور ترتیب کے سلسلے میں موصوف کو امتیاز حاصل ہے۔ مہدی افادی کے خطوط کو یکجا کر کے شائع کروانا اس ضمن میں ان کی بڑی خدمت سمجھی جاتی ہے۔

'فسانۂ عجائب' کے بنیادی متن کو تلاش و تحقیق کی منزل سے گزار کر شائع کروانے میں بھی محمود الٰہی نے خاصی دلچسپی لی۔ مدرسین، قارئین اور طلباء کی مشکلات کو وہ خوب سمجھتے تھے کہ اپنے دورانِ تدریس وہ خود بھی اس کلاسیکی داستان کے درست متن کی قرأت سے دوچار ہوئے تھے، لہٰذا انہوں نے 'فسانۂ عجائب' کی تدوین کا بیڑا اٹھایا اور بڑی محنت اور جانفشانی سے اسے ترتیب دیا۔ جو ترتیبِ متن اور متنی تحقیق و تنقید کے شعبہ میں نمایاں خدمت تسلیم کی جاتی ہے۔

محمود الٰہی کو خود جس قدر تحقیقی و تنقیدی کاموں سے شغف تھا اسی قدر انہیں نئے اور اچھوتے موضوعات تلاش کرنے کی بھی ہمیشہ جستجو رہی۔ اسی باعث انہوں نے تحقیقی کام کے لیے رجوع کرنے والے طلباء و طالبات اور ریسرچ اسکالروں کی بڑی مشفقانہ رہنمائی کی، اور اپنے زیرِ نگرانی اچھوتے اور بنیادی موضوعات پر مقالات لکھوائے۔ ڈاکٹر شکیل احمد اور جناب مشیر احمد کی اطلاع کے مطابق محمود الٰہی کے زیرِ نگرانی ڈی لٹ اور پی ایچ ڈی کے لیے ۳۷ مقالے تحریر کیے گئے۔ اس فہرست پر نظر ڈالنا بے جا نہ ہوگا:

نمبر	عنوان	مقالہ نگار	سن
۱	میر حسن: حیات اور ادبی خدمات	فضل الحق	۱۹۶۲ء
۲	اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	عبدالحق	۱۹۶۵ء
۳	ابوالکلام آزاد: فکر و فن	ملک زادہ منظور احمد	۱۹۶۷ء
۴	میر علی اوسط رشک: حیات و خدمات	محمد انصار اللہ	۱۹۶۷ء
۵	حسرت موہانی: حیات اور خدمات	احمر لاری (نور العین)	۱۹۶۹ء
۶	نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے	اشفاق احمد صدیقی	۱۹۷۱ء
۷	امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری	فضل امام رضوی	۱۹۷۴ء
۸	اردو میں تمثیل نگاری	غلام رسول مکرانی	۱۹۷۸ء

۹	فراق کی شاعری	افغان اللہ خاں	۱۹۷۸ء
۱۰	اردو ادب میں سیکولرزم	اختر بستوی	۱۹۷۹ء
۱۱	انیسؔ: شخصیت اور فن	فضل امام رضوی	۱۹۸۰ء ۱۵
۱۲	مہدی افادی: حیات اور ادبی خدمات	فیروز احمد	۱۹۸۰ء
۱۳	ناسخ: فکر و فن	محمد احسن	۱۹۸۰ء
۱۴	میر کی شعری لسانیات (غزلوں کی روشنی میں)	قاضی افضال حسین	۱۹۸۱ء
۱۵	اردو ادب کا تہذیبی و سماجی پس منظر (۱۸۵۷ سے ۱۹۱۴)	قاضی جمال حسین	۱۹۸۱ء
۱۶	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	عبیدہ بیگم	۱۹۸۱ء
۱۷	اقبال سہیل: حیات اور شاعری	محمد منور	۱۹۸۱ء
۱۸	اردو میں مختصر افسانہ نگاری کا ارتقا	عتیق عالم خاں	۱۹۸۲ء
۱۹	حالی کی نثر	مسعود اختر	۱۹۸۲ء
۲۰	سرسید کی نثر	انعام الحق	۱۹۸۳ء
۲۱	اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی ۱۹۴۷ء تک	شکیل احمد	۱۹۸۳ء
۲۲	اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی ۱۹۴۷ء تا حال	شاکرہ خاتون عثمانی	۱۹۸۳ء
۲۳	خواجہ احمد عباس: حیات اور ادبی خدمات	غلام حسین	۱۹۸۶ء
۲۴	منیر شکوہ آبادی: حیات اور خدمات	ریاض الدین	۱۹۸۶ء
۲۵	ہندوستانی اساطیر (اردو مثنویوں کے آئینے میں)	احمد بخش	۱۹۸۶ء
۲۶	راجندر سنگھ بیدی: حیات اور خدمات	محمد عمران خان	۱۹۸۶ء
۲۷	اردو کے غیر مذہبی سفرنامے	بشریٰ خاتون	۱۹۸۷ء
۲۸	تدوین تذکرہ طبقاتِ سخن	نسیم اقتدار علی	۱۹۸۷ء
۲۹	قاضی عبدالودود: شخصیت و خدمات	تحریر بیگ	۱۹۸۸ء
۳۰	اردو کے خطباتِ آزادی کی تدوین	سلیم احمد	۱۹۹۰ء
۳۱	تحریکِ آزادی کے فروغ میں اردو نثر کا حصہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۲ء تک	انوار احمد	۱۹۹۱ء
۳۲	اردو نثر کی ترقی میں تراجم کا کردار ۱۷۲۵ء تا ۱۸۳۷ء	عبدالرحیم	۱۹۹۱ء
۳۳	پنڈت آنند نرائن ملّا: حیات و شاعری	عبدالرشید	۱۹۹۱ء
۳۴	شفیق جون پوری: حیات و خدمات	فہمیدہ خاتون	۱۹۹۲ء
۳۵	نازش پرتاپ گڑھی: حیات اور شاعری	ظہیر احمد	۱۹۹۲ء
۳۶	فکر تونسوی: حیات اور خدمات	کنیز فاطمہ	۱۹۹۳ء
۳۷	اردو فکشن میں جنگِ آزادی کی عکاسی	رئیسہ خاتون	۱۹۹۴ء

درج بالا مقالات میں زیادہ تر کتابی شکل میں طبع ہوکر مقبولِ عام ہو چکے ہیں، اور اردو کی گراں قدر مطبوعات اور تحقیقات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اردو میں تحقیق کی سمت و رفتار اور تاریخ کے مطالعے کے بعد ان تحقیقی کاموں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بلا مبالغہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام عنوانات اور موضوعات ایسے ہیں جو اولین اور ابتدائی کام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

متعدد موضوعات پہلے پہل محمود الٰہی کی نگرانی میں ہی تحقیق کے لیے زیر غور آئے۔ یہ مقالات اشاعت کے بعد مستند حوالے کا درجہ رکھتے ہیں اور ادب کے شائقین میں مقبول ہیں۔ اسی طرح متذکرہ بالا ریسرچ اسکالروں میں سے کئی ایک کا شمار اِس وقت اردو ادب کی معروف ادبی شخصیات، اساتذہ اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔

الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ایسے محنت طلب موضوعات پر تحقیقی کام سرانجام دینے میں جہاں ریسرچ اسکالروں کا ذوقِ تحقیق و تنقید اجاگر ہوتا ہے وہیں نگراں کا شوقِ طلب و جستجو بھی اس خارزار کو گلزار بنانے میں کارفرما نظر آتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ محمود الٰہی نے جہاں ترتیبِ متن اور تدوینِ کلام کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا وہیں تنقید و تبصرہ نگاری میں بھی ہمیشہ حق کی جستجو پر نظر رکھی۔ اداریہ نگاری و مقدمہ نگاری کے معیار کو مزید معتبر بنانے کی کوشش کی۔ ہمیشہ اُن کا تحقیقی ذہن نئے حقائق کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ وہ اپنے مرتب کردہ متن یا تدوین شدہ کسی شہ پارے پر پیش لفظ لکھ رہے ہوں یا مقدمہ، تفصیل سے اظہارِ خیال کرتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے مکمل تحقیقی گفتگو کرتے ہیں۔ اپنے تنقیدی نقطۂ نگاہ کا سہارا لے کر جہاں مشاہیر کی لغزشوں کو اجاگر کرتے ہیں وہیں تحقیقی ادراک و بصیرت کے ذریعے حقائق بھی چھانتے جاتے ہیں اور جو نتائج پیش کرتے ہیں وہ انتہائی ٹھوس، قابلِ قبول اور خالص معلوم ہوتے ہیں، کہ یہی تحقیق کا تقاضہ بھی ہے۔

محمود الٰہی نے اپنی تحقیق کی بنیاد بارہا ایسے نکات پر رکھی جس پر انہیں اولیت کا درجہ حاصل ہوا۔ گویا ان کی پیش کردہ متعدد اطلاعات اور انکشافات کے وہ اوّل راوی ہیں۔ وہ اپنی تحریر میں معلومات کے بیش بہا ذخیرے پیش کرتے ہیں، بین السطور اور درمیانِ گفتگو حقائق سے متعلقات کو بھی غیر جانبداری سے بیان کرتے ہیں، بلکہ اسباب و علل، واقعات و عوامل وغیرہ کو بیان کرتے ہوئے اس قدر معروضی اور واضح اندازِ گفتگو اختیار کرتے ہیں کہ کہیں کوئی نکتہ مبہم اور گنجلک نہیں رہتا اور ایسے نئے نکات اور گوشے اجاگر کرتے ہیں جس سے قارئین کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے، بلکہ وہ ایسے نکات اور زاویے ہوتے ہیں جن پر بعد کے محققین انہیں مستقل موضوع بنا کر اپنی تحقیق کی بنا رکھ سکتے ہیں۔ یعنی محمود الٰہی کی پوری بحث و تمحیص اور گفتگو خالص ادبی اور تحقیقی ہوا کرتی ہے۔ یہ کارہائے نمایاں اور طرزِ تحقیق اُنہیں اردو کے بلند پایہ محقق کے منصب پر فائز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ نیز ادب میں تحقیقی رجحان کو فروغ دینے میں محمود الٰہی کی یہ کاوشیں فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

حواشی:

۱۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۲۰۰۵ء، صفحہ ۱۴
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً
۴۔ تحقیق و تنقید کا باہمی مناقشہ، مشمولہ سفینۂ نقد، مرتبہ پروفیسر زیبا محمود، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤ، نئی دہلی ۲۰۱۳ء صفحہ ۵۶۔۵۷
۵۔ خدمت ہے کہ سازش ہے، مشمولہ سفینۂ نقد، صفحہ ۴۶
۶۔ ایضاً صفحہ ۴۷
۷۔ ایضاً صفحہ ۴۴
۸۔ ادبی سفر: میری تحقیق و تنقید کا، پروفیسر محمود الٰہی، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ مارچ ۲۰۰۵ء، صفحہ ۳
۹۔ اردو میں جدید تحقیق کا آغاز، باز یافت، لکھنؤ ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۵
۱۰۔ ایضاً صفحہ ۱۷
۱۱۔ اردو میں عربی شعرا کا پہلا تذکرہ، باز یافت، لکھنؤ ۱۹۶۵ء، صفحہ ۱۶۷۔۱۶۸
۱۲۔ کلیاتِ سوداؔ کے دو قلمی نسخے، سفینۂ نقد، صفحہ ۲۰۷۔۲۰۸
۱۳۔ تذکرۂ بہادر سنگھ، باز یافت، صفحہ ۱۵۰
۱۴۔ مقدمہ، اردو کا پہلا ناول ۔۔خطِ تقدیر، لکھنؤ ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۴۔۳۵
۱۵۔ ڈاکٹر شکیل احمد، 'پروفیسر محمود الٰہی'، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ مارچ ۲۰۱۵ء صفحہ ۲۸۔۲۹/ مشیر احمد، گورکھپور میں تحقیق کی روایت، سہ ماہی فکر و تحقیق، اپریل تا جون ۲۰۱۴ء صفحہ ۱۶۳۔۱۶۴

□□□

پروفیسر محمود الٰہی اور مقدمہ الہلال

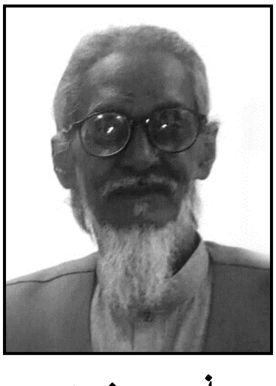

انس مسرور انصاری

سکراول (اردو بازار)
ٹانڈہ، امبیڈکر نگر
رابطہ: 7860220311

پروفیسر محمود الٰہی ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ان کے علمی وادبی کاموں کا مختصر تذکرہ بھی تفصیل طلب ہے۔ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین،شگفتہ اور علمی اندازِ بیان ،منفرد طرزِ نگارش اور دلائل و براہین بتاتے ہیں کہ ان کے موثرات کا سلسلہ دراز تر ہے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔مدرسہ کنز العلوم میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اسی مدرسہ میں اس وقت مجروحؔ سلطانپوری بھی زیرِ تعلیم تھے۔اس مدرسہ کے بانی اور شیخ الحدیث محمود الٰہی کے والد گرامی حضرت مولانا علیم اللہ صاحب تھے۔اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں محمود الٰہی بہت اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ایسے دینی وعلمی فضا و ماحول نے ان کی پرورش کی۔یہاں سے ان کی ذہنی وفکری نشوونما کا آغاز ہوا۔ ہرچند کہ بعد میں انھوں نے شاعری کو ترک کر دیا اور مستقل طور پر نثر کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تاہم ان کی ذات میں جس شاعر نے آنکھ کھولی اور ترقی کے مراحل و مدارج طےَ کیے تھے، وہ ان کی ذات میں ہمیشہ زندہ رہا اور نثر میں ان کے طرزِ نگارش کے ریشمی پردوں سے جلوہ افشانی کرتا رہا۔

بلاشبہ پروفیسر محمود الٰہی بہترین، ایمان دار اور اعلا درجہ کے ناقد تھے لیکن بنیادی طور پر ان کے مزاج کا غالب میلان ''تحقیق'' کی طرف رہا۔انھوں نے کتنے ہی طالب علموں کو نقاد اور محقق بنادیا۔ان کی کتابوں اور مضامین کی فہرست بتاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر محقق تھے۔ یہاں تنقید و تحقیق کے باہمی رشتوں کی توضیح کی ضرورت نہیں۔البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ محقق بنیادی طور پر ناقد بھی ہوتا ہے۔اسی لیے اچھے محقق کی پہچان بہترین تنقید نگاری کے حوالے سے بتائی گئی ہے۔ یہ دونوں اوصاف محمود الٰہی میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔شگفتہ اسلوب سے تحقیق وتنقید کی خشکی کو خوشتری میں تبدیل کر دینا، ان میں ایک اضافی خوبی تھی۔ ان کی تحقیق مین توانا اسلوب اور تنقیدی شعور نے دل کشی پیدا کردی ہے۔''الہلال'' کے تعلق سے پروفیسر محمود الٰہی رقم طراز ہیں۔

''الہلال'' کسی الف لیلوی داستان کے زمرے میں شامل ہوتا جارہا ہے۔اردو کے مختلف درجات کے نصاب میں مولانا آزاد کی تحریریں بجا طور پر شامل کی گئی ہیں اور جب اساتذہ ان

تحریروں پر درس دیتے ہیں تو 'الہلال' اوراس کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ طلبہ کے اندر الہلال کے دیدار کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے مگر اساتذہ ان کی خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتے کہ الہلال ایک جنسِ نایاب ہے۔ اگر کہیں کسی کے پاس کوئی شمارہ ہے بھی تو وہ اتنے پُراسرار طریقے سے اس کی جلوہ گری کا سامان بہم کرتا ہے کہ یہ جلوہ گری ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، کے ذیل میں آجاتی ہے۔ الہلال کے عکس کی اشاعت سے نئی نسل کی شکایت دور ہوجائے گی۔ کم از کم اتنا دعویٰ تو وہ کرسکتی ہے کہ اصل الہلال نہ سہی، اس نے اس کا عکس دیکھا ہے۔ الہلال کی یہ نئی جامہ پوشی اس کے اندازِ قدر کی بہرحال غمازی کرے گی۔''

(مقدمہ ''الہلال''، ص، ۱۴-۱۷)

''الہلال'' کی تحقیق وجستجو اور ترتیب وتدوین میں پروفیسر محمود الٰہی کو دشوار ترین مراحل سے گزرنا پڑا لیکن انتہائی حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ ان کے پائے استقامت میں ہلکی سی لغزش بھی نہیں آئی۔ اس بڑے کام کو تکمیل تک پہنچانے میں انھوں نے اپنی تمام تر علمی صلاحیتوں کو احسن طریقے سے استعمال کیا۔ اس طرح وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی۔ مسلسل جدوجہد نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور بلآخر ''الہلال'' کے تمام شمارے محفوظ ہوگئے۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ اردو دنیا پروفیسر محمود الٰہی کی ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

''جون ۱۹۸۷ء میں جب اتر پردیش اردو اکادمی کی تشکیلِ نو ہوئی اور میں کوئی چار سال کے وقفے کے بعد اس کی مجلسِ انتظامیہ کا ایک بار پھر چیئرمین نامزد کیا گیا تو میرے ذہن نے اس کا جو ترقیاتی منصوبہ مرتب کیا اس میں مولانا آزاد کی صد سالہ جشنِ ولادت کی تقریبات کو سرِ فہرست جگہ ملی اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں کسی طرح یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا لیکن چھ ماہ کی طویل کشمکش کے بعد میرے اندازِ فکر میں تبدیلی رونما ہوئی اور اس جذبے نے میری انفعالی کیفیتوں کو شکست دیدی کہ مولانا کی شخصیت اور ان کی تعلیمات کا عام کرنا ہمارے واجبات میں ہے اور اردو اکادمی اس قومی کام میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ میں نے جب اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ کے اراکین سے آزادصدی کے مختلف پہلوؤں پر غیررسمی گفتگو کی تو ان کے اندر اس منصوبے کی تکمیل کا ذوق مجھ سے کہیں زیادہ ملا اور آخرکار مجلسِ انتظامیہ نے اپنی پہلی نشست میں ''الہلال'' کی مکمل فائلوں کے عکس کی طباعت واشاعت کا منصوبہ بڑے عزم وحوصلے کے ساتھ منظور کرلیا۔ مجلسِ انتظامیہ نے محسوس کیا کہ مولانا آزاد کو اس سے زیادہ مخلصانہ خراجِ عقیدت اور کیا ہوگا کہ ''الہلال'' کا عکس ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا جائے۔''

(پیش لفظ، مقدمہ الہلال''، ص، ۱۴)

اردو صحافت کی تاریخ میں ''الہلال'' نے جو نقشِ دوام روشن کیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ وہ محض ایک اخبار نہ تھا بلکہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جدوجہد کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک پکار، ایک چیخ، ایک صدا، ایک دعوت، ایک پیغام ، ملک اور قوم کے نام۔ ایک ایسی تحریک جو انسان کے ظاہر وباطن دونوں کو مخاطب کرتی ہو۔ ''الہلال'' کے صفحات پر مولانا آزاد نے اپنے دل وجگر کے ٹکڑے بچھا دیے تھے۔ ان کو سمیٹنا اور جمع کرنا آسان نہ تھا۔ اکادمی کی مجلسِ منتظمہ کی منظوری اور ''الہلال'' کی تدوین واشاعت کے درمیان حوصلہ شکن مشکلات کا مرحلہ وار ایک طویل اور صبر آزما سلسلہ ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

'اسلاف علم وہنر اور سیم وزر کے مابین جو امتیازی لکیر کھینچتے آئے ہیں، اس کی حقانیت کا بار بار تجربہ ہوا لیکن ''الہلال'' کی فائلوں کی تلاش نے اسے آئینہ کردیا۔ اس کی اشاعت کے لیے ریاستی حکومت سے گرانٹ تو مل گئی لیکن اس کے صحیح وسالم اوراق کی فراہمی مرحلۂ جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا۔ مئی (۱۹۸۸ء) میں گورکھپور آگیا تھا اور برابر یہاں کے کتب خانوں کی تلاش اور ان سے استفادہ میں مصروف رہا۔ بعض ذاتی کتب خانوں کی فہرستیں بھی میں نے مرتب کرلی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ الہلال کے سارے شمارے مجھے گورکھپور میں ہی مل جائیں گے اور اگر دو چار شماروں کی کمی ہوگی تو وہ باہر کے کتب خانوں سے پوری ہوجائے گی۔ میرے اس یقین نے دھوکا نہیں دیا۔ قریب قریب سارے شمارے یہاں مل گئے بلکہ بعض بعض شماروں کی تو چھ چھ کاپیاں ملیں لیکن دست بردِ زمانہ نے ان شماروں کی جو گت بنادی تھی اس نے میرے عزم وحوصلے کو متاثر کردیا۔ کسی کا سرِ ورق غائب ہے، کسی کے بیچ کے صفحات غیر حاضر ہیں۔ بعض فائلیں ناقص الاوّل، بعض ناقص الآخر اور بعض ناقص الطرفین نکلیں۔ بعض شماروں سے

تصویریں غائب تھیں اور عجوبے کی حد یہ تھی کہ بعض شماروں کے ایک کالم کو دیمک چاٹ گئی تھی اور بعض کے دوسرے کالموں کو۔ غرض یہ کہ ''الہلال'' کی دستیابی کی جہاں خوشی تھی وہاں اس کا غم تھا کہ اس کا عکس کیوں کرلیا جائے گا۔

'بہت سی تدبیریں اور ترکیبیں ذہن میں آئیں لیکن میں نے یہ کیا کہ سب سے پہلے سارے شماروں کے کارڈ بنا لیے اور اس کے اندراجات اس طور پر مکمل کیے گئے کہ جن سے بعض علمی اشارات کی نشان دہی بھی ہوجائے اور عاریتاً دینے والوں کے نام بھی۔ اور بعض شماروں کی ہیئت کذائی بھی واضح ہو جائے۔ میں نے اپنی بیوی کے سامنے مسائل رکھے۔ اور اس سے کہا کہ میں ہفتے دو ہفتے کے لیے سارے گھر کو اس کام میں لگانا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ گھر کے معمولات میں فرق بھی نہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق گھر کا ہر فرد اس میں میری مدد بھی کرے۔ ماں کا حکم ہوا تو میرا بیٹا مشہود اور بیٹیاں عذرا، بشریٰ، قدسیہ، فوزیہ اور زیبا ''الہلال کے کام میں لگ گئیں۔ سارا گھر ''الہلال'' کی اصل فائلوں اور ان کی الیکٹرونک اسٹیٹ کاپیوں سے بھر گیا۔ کرسیوں پر میزوں پر ہر جگہ الہلال کے شمارے بھرے ہوئے تھے۔ اور اللہ کا نام لے کر ہم سب نے ہر شمارے کے ایک ایک ورق کو دیکھنا شروع کیا اور جہاں کوئی نقص نظر آتا اسے فوراً اسی شمارے کی دوسری کاپیوں سے درست کرلیا جاتا۔ اس کی صورت یہ اختیار کرگئی کہ متاثرہ عبارت پر صاف عبارت والا فوٹو چپکا دیا جاتا اور پھر اس طرح کے اوراق کا دوبارہ الیکٹرو اسٹیٹ کرالیا جاتا تاکہ اس کی نگیٹیو بننے میں دشواری نہ ہو۔ دن بھر بلیڈ سے کاٹ کاٹ کر زخمی اوراق پر مرہم پٹی رکھا جاتا اور شام کو ان کا الیکٹرو اسٹیٹ کرالیا جاتا۔ صبح کوئی تین چار بجے جب سو کر اٹھتا تو ان نئے اوراق کا حرفاً حرفاً مطالعہ کرتا کہ کہیں کوئی نقطہ یا حرف متاثر تو نہیں ہوگیا ہے۔'

(مقدمہ الہلال ص، ۱۷۔۱۸)

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ ہمیں ادراک و عرفان ہو کہ الہلال کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدوین کے لیے پروفیسر محمود الٰہی نے کس قدر جاں فشانی، دیدہ ریزی، دور بینی و دور اندیشی سے ایک ایسے علمی و ادبی خزانہ کو جمع کر کے قوم کے سامنے پیش کر دیا جو اپنی مثال آپ ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ناقابلِ بیان محنت ومشقت، حوصلہ مندی وخیر خواہی، جذباتی وابستگی اور احساسِ ضرورت کے تحت ''الہلال'' منصۂ شہود پر آیا۔ جب بھی مولانا آزاد اور الہلال کی بات آئے گی تو یہ بھی ضرور کہا جائے گا کہ محمود الٰہی نے 'الہلال' کو حیاتِ نَو بخشی۔ اسی کے ساتھ اس قدر وقیع اور ایسے علمی کاموں کے لیے اتر پردیش اردو اکادمی کو بھی ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

'الہلال' کی تدوین و اشاعت پروفیسر محمود الٰہی کا اتنا بڑا علمی و ادبی اور تحقیقی کارنامہ ہے جو لائقِ صد تحسین وستائش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''الہلال''، محض ایک اخبار نہ تھا بلکہ وہ مولانا آزاد کا ایک مشن تھا۔ ایک تحریک تھی۔ ایک پیغام تھا۔ ایک دعوت تھی۔ ہندو مسلم یک جہتی کی دعوت! قومی وملّی اتحاد و اتفاق کی دعوت!! اس ایک دعوت میں کئی دعوتیں تھیں جن سے ملک و ملت میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ الہلال کے اثرات نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی دعوت اور ان کی آواز ایشیا سے یورپ تک گونج رہی تھی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

'جس اخبار کا مقصدِ اشاعت ایک مخصوص دعوت ہو۔ ایسی دعوت جو ملت کو مفاد پرستی کے مانوس اور شناسا راستوں کو ترک کر دینے کی تلقین کرے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ترغیب دے، اس کا ردِ عمل مثبت ہوسکتا ہے اور منفی بھی۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سے مولانا کی کوئی ذاتی اور شخصی غرض وابستہ نہیں تھی۔ مولانا کا یہ اقدام فی سبیل اللہ تھا۔ حالات نے ان کی رگ وپَے میں ایک جذبۂ آتش فشاں دوڑا دیا تھا جو الہلال کی صورت میں ایک دن پھوٹا اور اس طرح پھوٹا کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک بھی اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔'

(مقدمہ الہلال۔ص، ۳۷)

مولانا آزاد کا مقصد ومدعا مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے بلکہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کو ملک کی آزادی کے لیے ناگزیر خیال کرتے تھے۔ انھیں ملک کا وقار بھی بہت عزیز تھا اور ملّی تشخص بھی۔ ملک کی آزادی اور ترقی وخوشحالی ان کا خواب تھا۔ برطانوی سامراج کے دوقومی نظریہ کے وہ شدید مخالف تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بہ حیثیت مجموعی وہ ایک ہندوستانی قوم سمجھتے تھے۔ البتہ وہ

خاص طور پر مسلمانوں کے تعلق سے بہت فکر مند تھے۔ کیونکہ مسلمان بری طرح انتشار کا شکار تھے۔

مولانا آزاد نے ۱۹۲۳ء میں پہلی بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارتی ذمہ داریاں قبول کیں۔ دہلی میں منعقدہ اجلاس میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

’غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گزشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالعہ کررہے ہیں، اس سے واقف ہوں گے کہ ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلی صدا میری صدا تھی جو اس طرزِ عمل کے خلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علاحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کررہے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں ۔کانگریس میں شریک ہوں، ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں اور فرقہ وارانہ تنظیم سے کنارا کش ہوجائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آ گیا جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا۔ جب ۱۹۱۶ء میں مَیں رانچی میں نظر بند تھا تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔‘

(بحوالہ۔ مقدمہ ’’الہلال‘‘ص، ۲۳۔۲۴)

مولانا آزاد نہایت گہری سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی تمام تر جدوجہد کا مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا۔ وہ اسی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ مسلمانوں کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر مجتمع و متحد دیکھنے کے آرزومند تھے۔

مولانا آزاد جب دوسری بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے تو ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں اس کا اجلاس ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

’’....ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ کہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ ہندوستان کے ۹/کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہِ عمل ہوسکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔ میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے۔ میں اس اختلاف کے لیے انھیں ملامت نہیں کروں گا۔ میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔‘‘

(بحوالہ’’مقدمہ الہلال‘‘ص، ۲۴)

اپنی ابتدائی صحافتی زندگی کے آغاز سے ’’صداقت‘‘ اور ’’سچائی‘‘ کا اظہار و اعلان کرتے کرتے مولانا آزاد کی ذات خود صداقت و سچائی کی علامت اور پہچان بن گئی۔ پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

’’مولانا نے اسلامی تعلیمات پر مبنی جس راہِ عمل کو اختیار کیا اسی کا نام دعوتِ الہلال رکھا تھا اور عمر بھر وہ اسی دعوت کا اعادہ کرتے رہے۔ ان کی دعوت کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہنا چاہئے۔ اس میں اتنی وسعت تھی کہ انسانی فلاح کی جزئیات کا بھی وہ احاطہ کرلیتی ہیں۔ دوقومی نظریئے کا بطلان، ہندو اور مسلم اتحاد اور ملکی سالمیت ان کی دعوت کے مظاہر تھے۔ حصولِ آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد، آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شمولیت اور فکر و نظر کی آزادی مولانا کی دعوت کی اہم قدریں تھیں۔‘‘

’’الہلال‘‘ کی ۴/فروری ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں وہ رقم طراز ہیں:

’’آغازِ اشاعتِ الہلال سے ’دعوت‘ کا لفظ میری زبان پر ہے اور اس کثرت سے بار بار اس لفظ کو دہراتا ہوں کہ شاید بعض لوگ سنتے سنتے اکتا سے گئے ہوں گے۔ میں نے ہمیشہ ایک ’’دعوت‘‘ کا اعلان کیا جو ایک مقصودِ خاص کو اپنے سامنے رکھتی ہے اور ساتھ ہی چند مقاصد پیش کیے جو ہمیشہ سے انسانوں کی جماعتوں اور آبادیوں کے سامنے پیش ہوتے آئے ہیں۔ ان مقاصد میں ندرت وجدت نہ تھی مگر صداقت ضرور تھی

اور جس بیان میں صداقت ہو ضرور ہے کہ وہ نئی نہ ہو، کیونکہ دنیا کی سب سے زیادہ پرانی چیز صداقت ہی ہے۔''

(بحوالہ ''مقدمہ الہلال'' ص،۳۵۔)

مولانا آزاد نے دعوتِ الہلال کی توضیح وتصریح بار بار کی ہے۔اسی دعوت کو یوسفِ مقصود کہنا چاہیے اور اسی دعوت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک سمجھنا چاہیے ۔اسی دعوت میں وہ حقیقت بے نقاب ہوئی ہے جس کا دامن مولانا آزاد نے کبھی نہیں چھوڑا۔

۱۹۲۱ء کے نومبر میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا۔اس میں مولانا آزاد نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس کا یہ اقتباس قابلِ لحاظ ہے۔

.....۱۹۱۲ء میں مَیں نے الہلال جاری کیا۔حضرات! مجھے امید ہے کہ آپ مجھے خودستائی اور خودفراموشی کا الزام نہ دیں گے،اگر میں بطور تحدیثِ نعمت اس موقع پر دعوتِ الہلال کا بھی ذکر کروں۔آج آپ کی یہ مقدس ومبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے،میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسفِ مقصود ہے جس کے فراق میں ۱۹۱۱ء سے متصل یا اسفا علی یوسف،کی فغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشمِ خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے،اور اس کے مواد وحروف کے اوپر اپنے دل وہ جگر کے ٹکڑے بچھادیے ہیں۔۱۹۱۱ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤ ں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق وشیفتگی کا محبوب رہا ہے۔خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی.....جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم واندوہ پر بے قراری سے کروٹیں نہ بدلی ہوں۔میں اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی وقید کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کانٹے پس اے بزرگانِ ملّت!اگر آج علمائے امت کی یہ نہضت مبارکہ جمیعۃ العلماء کی شکل میں طالع ونظر افروز ہوئی ہے،تو مجھے کہنے دیجئے یہ میرے دہ سارے سوالوں کا جواب ہے،میری تمناؤں اور آرزوؤں کا ظہور ہے،میری فریاد اور التجا کی قبولیت ہے۔''

(بحوالہ مقدمہ الہلال۔،۳۴۔)

مولانا آزاد کی دعوت کیا تھی۔؟اس کے عوامل وعواقب اور نتائج کیا نکلے؟اس ضمن میں آپ کو خاصا کچھ علم ہو چکا ہے۔مولانا نے صحافت کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا بلکہ اسے قومی بیداری اور اصلاحِ ملک وقوم کے لیے وقف کر دیا۔وہ ملّی بیداری کے خواہاں تھے اور غفلتوں،کوتاہیوں ،نادانیوں،بے خبریوں اور مایوسیوں میں حوصلوں کو بلند کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ ''الہلال'' کے پہلے شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ میں مولانا لکھتے ہیں:

''آہ کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔اسی ایک صدائے رعد عصائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلّت ورسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو، کیونکہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے اور تمھیں موت کی جگہ حیات،زوال کی جگہ عروج اور ذلّت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔''

مولانا ابولکلام آزاد کی تحریروں کے اقتباسات سے ''مقدمہ الہلال'' مزیّن ہے جن سے مولانا کی ہمہ جہت شخصیت اوران کے کارناموں کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو جاتی ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی نے اپنے مقدمہ میں مولانا آزاد کی پُروقار شخصیت،ان کے خصائص وکمالات،ان کے نظریہ وخیالات،فکروشعور اور جادۂ عمل کی توضیح وصراحت اس خوبی سے کی ہے کہ سب کچھ آئینہ بردوش ہو گیا۔مولانا آزاد کے مقصدومدعا اور الہلال کے تمام قابلِ ذکر گوشوں کی توضیح وتصریح ''مقدمہ الہلال'' میں موجود ہے۔مولانا آزاد کے ادیبانہ اور خطیبانہ اسلوب کے مختلف پہلوؤں پر بھی محمود الٰہی نے خاصی توجہ کی ہے۔بقول ان کے مولانا آزاد جس اسلوب کے موجد تھے وہی اس کے منتہی اور مختتم بھی ہوئے۔ان کی زبان اور اسلوب کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی۔

''مقدمہ الہلال'' میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں وہیں اس کے قارئین کو شکایت بھی ہے کہ وہ مولانا آزاد کی ابتدائی صحافتی زندگی کے احوال ومعاملات سے محروم وبے خبر ہیں۔ مگر چونکہ محمود الٰہی صاحب کا موضوعِ خاص ''الہلال'' رہا ہے،اس لیے انھوں نے الہلال کے عوامل وعواقب اور اجتہادو تعلیمی موثرات کی طرف خصوصی توجہ مبذول رکھی اور سارے کا سارا فوکس الہلال ہی پر مرتکز رکھا۔یہاں تک کہ ''البلاغ'' کا ذکر بھی عمومی اور ضمنی طور پر ہی ہوا ہے۔مولانا آزاد کی

ابتدائی صحافتی زندگی سے انھوں نے صرفِ نظر کیا۔ موضوع کے اعتبار سے وہ حق بجانب ہیں تاہم جہاں انھوں نے مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، ان کی ابتدائی صحافیانہ زندگی کے تعلق سے بھی کچھ نہ کچھ مذکور ہونا چاہیے تھا۔ اس سے مقدمہ کی افادیت میں مزید اضافہ ہوجاتا اور اردو اسکالرس کو مولانا کی صحافتی بنیادوں کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی۔

مولانا آزاد کو قدرت نے اپنی جن بے حساب نوازشوں سے فیضیاب کیا تھا ان کا حال نوجوانی میں ہی ظاہر ہونے لگا تھا۔ گویا شباب سے پہلے مولانا پر شباب آگیا۔ ان کے علم وفن، فضل وکمال اور صلاحیت کے چرچے شروع ہوگئے۔ یہی وجہ تھی کہ علّامہ شبلی نعمانی کی نظر نے آزاد کے اندر پوشیدہ جوہروں کو دیکھ لیا اور ''الندوہ'' جیسے اہم رسالہ کی ادارت ان کے سپرد کردی۔ اس سے پہلے مولانا آزاد کلکتہ کے ماہنامہ ''نیرنگِ نظر'' ہفت روزہ ''المصباح'' رسالہ محمدیہ'' ہفت روزہ ''احسن الاخبار'' پندرہ روزہ ''لسان الصدق'' شاہ جہاں پور کے ''اڈورڈ گزٹ''، لکھنؤ کے ''خدنگِ نظر'' سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ ان رسائل وجرائد سے وابستگی اور مسلسل خامہ فرسائیوں سے آزاد کی صحافیانہ صلاحیتوں کو نکھرنے، سنورنے اور نشوونما پانے کا خوب موقع ملا۔ مگر اصل میں ''الندوہ'' لکھنؤ اور ''وکیل'' امرتسر، وہ رسائل ہیں جن کی ادارت کے دوران ان کی مشقِ صحافت ''الہلال'' میں ان کے بہت کام آئی۔

۱۹۰۲ء کے آس پاس کلکتہ سے شائع ہونے والا ''احسن الاخبار'' بند ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد مولانا آزاد نے ''لسان الصدق'' کلکتہ سے جاری کیا۔ یہ پہلا پندرہ روزہ اخبار تھا جس کے وہ کُلّی طور پر مالک تھے۔ اس اخبار سے منسلک دوسرے افراد محض ان کے معاون ومددگار تھے۔

''لسان الصدق'' کا پہلا شمارہ نہایت خاموشی کے ساتھ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو تارا چند اسٹریٹ کلکتہ ۱۶ سے جاری ہوا۔ اس وقت آزاد کی عمر ۱۵۔۱۶ برس کی تھی۔ یہ اخبار بہت پسند کیا گیا۔ مختلف رسائل وجرائد میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ معاصرین نے خیال کیا کہ یہ رسالہ کسی معمّر، کہنہ مشق اور تجربے کار اہلِ قلم کی ادارت میں جاری ہوا ہے۔ ''لسان الصدق'' حق اور سچائی کا سمبل تھا۔ حق گوئی وبے باکی اس کے عمل کا اساسی دستور تھا۔

مولانا آزاد مذہب اور ادب کو صحافت سے جوڑنے والے اردو کے پہلے صحافی تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے سیاست کے اندھیروں میں حق وصداقت اور ایمان عمل کی شمعیں روشن کیں۔ ان کا ذہن ایک عالم کا ذہن تھا۔ ان کا مزاج ایک مفکر کا مزاج تھا۔ ان کی اصابتِ فکر ایک فلسفی کی فکر تھی لیکن وہ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ کیونکہ ان کی طبیعت کا رجحان ابتدا ہی سے اخبار نویسی کی طرف مائل رہا۔ وہ ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور اس کے نفوذ واثر سے بخوبی واقف وآگاہ تھے۔ ان کے نزدیک ایماندارانہ صحافت ایک طاقت ورصداقت تھی جس کے ذریعے داخلی وخارجی انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ اور انھوں نے الہلال کے ذریعے انقلاب برپا کیا۔ ایک ایسا انقلاب جس نے خوابیدہ روحوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''الہلال'' (۱۹۱۲ء) تک آتے آتے مولانا بڑی قدآور شخصیت کے مالک ہوچکے تھے۔ ان کے پاس علم اور تجربہ دونوں تھا۔ انھوں نے الہلال میں اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کے جوہر کھل کر دکھائے اور اسے گنجینۂ معانی کا طلسم بنا دیا۔ اس گنجینۂ معانی کے طلسم کو پروفیسر محمود الٰہی نے سات ضخیم جلدوں میں سمیٹا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا۔ یہ ''مقدمہ الہلال'' ایک ایسا نگارخانۂ علم وادب ہے جو مولانا آزاد کی پہلو دار شخصیت، ان کی عظمت، ان کی علمی وجاہت، نظریہ وخیال، مقصد، جذبہ وحوصلہ، ان کی تحریروں اور تقریروں کے اہم ترین اقتباسات اور خود محمود الٰہی کے علمی لیکن شگفتہ وتوانا اسلوب اور توضیحی کلمات سے روشن ہے۔

''الہلال'' کے تعارف کے لیے ''مقدمہ الہلال'' کا مطالعہ ناگزیر سا ہے۔ محمود الٰہی نے مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی فعالیت کی ایسی تصویرکشی کی ہے کہ ''الہلال'' کا مکمل تعارف حاصل ہوجاتا ہے اور مولانا کی عظمت دل میں بیٹھ کر رہ جاتی ہے۔ جن کی رسائی ''الہلال'' تک نہیں ہے ان کے لیے ''مقدمہ الہلال'' ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں، جو طلبہ واساتذہ کے لیے اکتسابِ فیض کا بہترین ذریعہ ہے۔

'مقدمہ الہلال' میں نہ صرف مولانا آزاد کی باوقار شخصیت کے کئی اہم پہلو روشن نظر آتے ہیں بلکہ ان کے اسلوب اور طرزِ نگارش پر بھی محمود الٰہی کی سیر حاصل گفتگو نے اسے نہایت علمی وادبی خزینہ بنادیا ہے۔

□□□

اردو تحقیق کی آبرو: پروفیسر محمود الٰہی

داؤد احمد

صدر شعبۂ اردو
فخر الدین علی احمد گورنمنٹ
پی جی کالج محمود آباد، سیتاپور
رابطہ: 8423961475

اردو ادب میں پروفیسر محمود الٰہی نے جو خدمات انجام دیں اسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور اپنی پوری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزار دی۔ کتابوں کی تدوین اور مخطوطات کی تلاش میں اپنی زندگی کا بیش بہا سرمایہ صرف کر دیا۔ تحقیقی و تنقیدی میدان میں بے مثل خدمات کیں۔ پروفیسر محمود الٰہی ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک مفکر کا نام ہے۔ ترقی پسندانہ ذہنیت کے مالک ہونے کے باوجود اسلامی شعور ہمیشہ ان کے اندر کارفرما رہا۔ ان کے اندر فکر کی بالیدگی بھی تھی اور فن کا شعور بھی۔ ان کے جیسا قلم کار آج کے دور میں مفقود ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کا اصل میدان تحقیق و تنقید ہے۔ دراصل تحقیق دریافت کا ایک ایسا عمل ہے جو روز و شب نئے دریچے کھولتا ہے اور تہہ در تہہ پوشیدہ حقیقتوں اور سچائیوں و رازہائے درون بستہ کے جگر بھی چاک کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تحقیق قید و بند سے مبرا خالص ایک تخلیقی عمل ہے۔ جو ہمیں حقیقتوں سے آشکار کرتی ہے۔ تحقیق صحیح معنوں میں تلاش حق ہی کا دوسرا نام ہے۔

منظر کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کا بھی ایک قابل ذکر خاندانی پس منظر رہا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا علیم اللہ اپنے وقت کے برگزیدہ علمائے کرام میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے ممتاز تلامذہ میں رہے ہیں نیز شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے افکار و نظریات سے کسب فیض کیا تھا۔ ٹانڈہ (ضلع امبیڈکر نگر) کی دینی و علمی درسگاہ مدرسہ کنز العلوم کے بانی اساتذہ اور شیخ الحدیث رہے ہیں اور تاحیات درس و تدریس کے حوالے سے اس کارہائے جلیلہ کو انجام دیتے رہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کی پیدائش صوبہ اتر پردیش کے مقام ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر میں ۲/ستمبر ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوا۔ مقامی اسکول سے ہی اپنی تعلیم شروع کی اور وہیں سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ان ہی دنوں محمود الٰہی نے اپنا تخلص زخمیؔ رکھا اور ''زخمیؔ ٹانڈوی'' کے نام سے شاعری بھی کی۔ ان کے کلام کا ایک مطلع اور ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

جنوں پہ رنگ چڑھا شیطنت پہ رعنائی
نظام دہر نے چپکے سے لی جو انگڑائی
جنگ کی کالی گھٹاؤں کو کفن پہنا دو
زہر آلود فضاؤں کو کفن پہنادو
اٹھو مزدورو اور اے امن کے پیغامبرو
عصر حاضر کے خداؤں کو کفن پہنادو

ابتدائی زمانے میں وہ انقلابی شاعری کی تخلیق و ترجمانی کرتے رہے بعد میں وہ تخلیق شعر سے دست بردار ہوگئے مگر زخمی تخلص نام و نشان سے چسپاں ہی رہا۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد محمود الٰہی آگرہ چلے آئے اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یہیں آگرہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔اس یونیورسٹی سے انھوں نے اردو میں بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں امتیازی نمبروں سے حاصل کیں۔اس کے بعد انھیں پی ایچ۔ڈی کرنے کا خیال ہوا۔اس کی خاطر انھوں نے اردو کے مشہور نقاد،ادیب اور استاد پروفیسر محمد حسن سے قربت حاصل کی اور ان ہی کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ۱۹۵۸ء میں حاصل کی۔پی ایچ۔ڈی کے لئے ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ''۔اسی سال یعنی ۱۹۵۸ء میں محمود الٰہی گورنمنٹ کالج رامپور میں اردو کے لکچرر ہوئے۔مگر یہ جگہ تو معمولی تھی انھیں اور اونچا جانا تھا لہٰذا ۱۹۵۸ء میں ہی موصوف گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد مقرر کر لئے گئے اور وہیں سے ۱۹۹۱ء میں وہ پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

اسی ملازمت کے دوران تین دفعہ دو برسوں کے لئے موصوف اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین بھی رہے جہاں سے انھوں نے اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

پروفیسر محمود الٰہی (مرحوم) کے برادر بزرگ ڈاکٹر ظہور الحق نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ عربی سے وابستہ رہ کر اپنی ایک انفرادی شناخت قائم کی ہے:

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

پروفیسر محمود الٰہی اردو کے ایک مایہ ناز محقق و نقاد ہیں۔رشید احمد صدیقی صف اول کے تخلیق کار بھی ہیں اور نقاد بھی،ان کی تنقیدی بصیرت کا زمانہ اعتراف کرتا ہے۔پروفیسر محمود الٰہی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، ملاحظہ کیجئے:

''ڈاکٹر محمود الٰہی اردو کے ان اہل قلم کی صف میں داخل ہو چکے ہیں جن کو ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کے اعتبار سے ممتاز درجہ حاصل ہے۔''

(بحوالہ بازیافت:ڈاکٹر محمود الٰہی صفحہ۔۲۲۳)

پروفیسر محمود الٰہی شریف النفس اور شرافت علمی کے شاہکار تھے۔پیکر ایثار اور درد مند دل کے مالک تھے۔ہوس سیر و تماشا سے بے نیاز رہے۔پوری زندگی سادگی سے عبارت تھی مگر عزت و حمیت میں مرد تھے۔ان کی خدمات اردو زبان کے تئیں جو ہے وہ ہم بجا طور پر آج کہہ سکتے ہیں کہ وہ بابائے اردو تو نہ سہی لیکن شمالی ہند کے آقائے اردو ضرور ہیں اس لئے کہ اردو کا اتنا بڑا سپاہی ماضی قریب میں کوئی نظر نہیں آتا۔وہ ایک فرد نہ تھے بلکہ اپنے وجود میں ایک مخصوص موثرات کی تربیت گاہ تھے۔ان کی راہ کہکشاں میں کیسے کیسے علمی چراغ فروزاں ہوئے۔پروفیسر انصار اللہ نظر،عبدالحق، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد،پروفیسر فیروز احمد، پروفیسر فضل امام رضوی،پروفیسر جمال حسین، پروفیسر اصغر عباس،پروفیسر افضال حسین، پروفیسر فضل الحق مرحوم وغیرہ کی خدمات سے اردو دبستان کی دہلیز روشن ہو رہی ہے۔

قاضی عبدالودود پروفیسر محمود الٰہی کے محترم و بزرگ رفقاء میں سے تھے۔پروفیسر الٰہی نے اپنی تحقیق کی راہوں میں قاضی صاحب سے بے شمار کرنیں سمیٹی ہیں۔جگہ جگہ استفادے کئے ہیں اور ان کے اصول تحقیق کو عملی شکل دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''الہلال'' کی تدوین و ترتیب میں پروفیسر الٰہی نے جو عرق ریزیاں کیں یا''تذکرہ شورش'' کے تعلق سے جو صعوبتیں جھیلیں،اس بات کی غماز ہیں۔بہر کیف قاضی عبدالودود پروفیسر محمود الٰہی کے تحقیقی مجاہدے کے بے حد معترف ہیں۔

''بازیافت'' پروفیسر محمود الٰہی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں شامل مضامین درج ہیں:''اردو میں جدید تحقیق کا آغاز طبقات شعرائے ہند،اردو ڈرامہ اور انارکلی،مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم اخبار،ناسخ کا دیوان دوم،شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک اور نثری کارنامہ،تذکرہ بہادر سنگھ،اردو میں عربی شعرا کا پہلا تذکرہ،مقدمہ تذکرہ شورش اور احتشام حسین بحیثیت نقاد۔'' انارکلی ڈرامے پر شامل مضمون الٰہی صاحب کی نظر میں اب تک لکھا گیا سب سے اچھا اور فکر انگیز مضمون ہے۔اردو ڈرامہ اور انارکلی پہلی بار ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔یہ مضمون پروفیسر محمود الٰہی کے تنقیدی اور تحقیقی زندگی کا نقش اول ہے۔اپنے اس مضمون میں پروفیسر الٰہی یہ خیال ظاہر کرتے

ہیں کہ ڈرامہ ایک اہم صنف ادب ہے اور 'انارکلی' 'اردو ڈراموں کا سرتاج ہے۔ اسی طرح سرسید کی تحقیقات پر مضمون نقطۂ تحقیق کا حرف آغاز ہے۔ نکات الشعرا کے دوسرے قلمی نسخے کی دریافت اور متن کی بحالی بھی دلچسپ تحقیقی کوشش ہے۔ اسی طرح فسانۂ عجائب کے اہم اور بنیادی متن کی اشاعت سے انھوں نے نئی جہات کی دریابی کی۔ اردو فکشن میں ''فسانۂ عجائب'' کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس کے باوصف پروفیسر محمود الٰہی کے خیال میں یہ داستان اردو نثر کی فطری نشوونما کا ایک حصہ نہیں ہوسکی۔ بہت زمانے کے بعد پروفیسر محمود الٰہی کو اس کتاب کا ایک خطی نسخہ ملا ہے جس سے بہت سی متعلقہ باتیں غلط ثابت ہوجاتی ہیں۔ حاصل شدہ نسخے کی پروفیسر الٰہی نے ازسرنو تحقیق کی اور کافی تفتیش اور تصحیح کے بعد اس متن کو شائع کیا اور ''فسانۂ عجائب کا بنیادی متن'' نام رکھا۔ متن کی تحقیق، ترتیب، تدوین اور اس سے متعلق جس قدر بھی تقاضے ہوسکتے ہیں، ان تقاضوں کے عرفان اور ان کی عمل پاسداری میں پروفیسر محمود الٰہی کا نام لوگ بڑے فخر کے ساتھ لیتے ہیں۔ موصوف اس علم میں جس رتبے پر فائز ہیں اسے قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی جیسے نامور اور عظیم محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا طریقۂ کار کچھ مختلف تھا، اگر وہ کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو یا تو اس پر اضافہ کرتے یا اس کا بھرپور تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کرتے۔ ان کو کبھی یہ بات پسند نہ آئی کہ صرف نقطے درست کرکے ترتیب و تدوین میں نام ڈال دیا جائے۔ 'فسانۂ عجائب کا بنیادی متن' اردو تحقیق میں الٰہی صاحب کا ایک قابل احترام اور اضافی کارنامہ ہے۔

دیوان ناسخ، صحیفہ محبت وغیرہ اہم دستاویزات کی دریافت بھی ان کی تحقیقی کاوشوں میں خوش گوار اضافے ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی سب سے مفید اور معتبر کتاب'' اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۷۳ء میں پہلی بار شائع کیا تھا۔ یہ پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انھیں ۱۹۵۸ء میں سند تفویض ہوئی تھی۔ یہی ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ یہ بات کسی حیرت فارابی سے کم نہیں ہے کہ بیشتر بزرگ اساتذہ کی طرح ڈاکٹر محمود الٰہی کا تحقیقی مقالہ ہی ان کی شہرت کا سبب بنا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ''ذوق سوانح اور انتقاد'' کے لئے جانے پہچانے گئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' کی بدولت شناخت قائم کرسکے بلکہ لکچررشپ، ریڈرشپ اور پروفیسرشپ کے لئے یہی کتاب معاون بنی۔ باقی تمام تصانیف طفیلی ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مولانا ابوالکلام آزاد کی وجہ سے متعارف ہوئے۔ ان بزرگوں کے یہ مقالے ہی عمر رائگاں کے محصولات ہیں۔ یہ کتابیں طالب علمی کے زمانے کی یادگار ہیں۔

ڈاکٹر محمود الٰہی نے ۱۹۶۵ء میں ''اردو کا پہلا ناول خط تقدیر'' شائع کرکے ایک نئی بحث کا آغاز کیا۔ فکشن کے فریب وحقیقت کا فسانہ حوالہ بنتا گیا۔ ''تذکرۂ شورش'' اور ''طبقات الشعرائے ہند'' (۱۹۸۴، ۱۹۸۳) تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اہم دریافت کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بکھرے ہوئے مضامین کی بڑی تعداد ہے۔ الہلال کے ساتھ کلاسیکی متون کی اشاعت اور انتخاب ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے جب الہلال والبلاغ کی جلدوں کو مرتب کیا تو مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال کو لازم وملزوم قرار دیا۔ مقدمہ الہلال میں آپ کی نثر کی برجستگی، روانی، نادر الفاظ و تراکیب، برمحل محاوروں اور عربی فارسی اشعار کے استعمال کے قوس وقزحی رنگ کو جس فنکارانہ چابکدستی سے برتا اسے حلقۂ ارباب ذوق نے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالیا۔ فرماتے ہیں:

''الہلال کسی الف لیلوی داستان کے زمرے میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ الہلال ایک جنس نایاب ہے۔ الہلال کی یہ نئی جامہ پوشی اس کے انداز قدر کی بہر حال غمازی کرے گی۔''

(مقدمہ الہلال۔ مرتبہ زیبا محمود، صفحہ ۱۶)

الہلال و البلاغ کی اشاعت کو اردو صحافت کا عہد زریں تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں اخبارات مختلف لائبریریوں اور شخصی کتب خانوں میں بکھرے پڑے تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے کافی محنت و مشقت کرکے ان دونوں اخبارات کی فائلوں کو جمع کیا اور انھیں کتابی شکل میں شائع کرکے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اردو ناول کے تعلق سے بھی پروفیسر محمود الٰہی کا اہم تحقیقی کام رہا ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر انھوں نے کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی لیکن انھوں نے اردو کا پہلا ناول 'خط تقدیر' کے مقدمے میں جو تنقیدی نوٹ لکھا ہے وہ ناول کے فن پر ایک اہم مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'خط تقدیر' سے اردو میں قصہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ہمارے افسانوی ادب میں مغربی اقتدار کے زیراثر جو تبدیلی ہوئی اب تک کی تحقیق کے مطابق اس کا یہ اولین نمونہ ہے۔

ناول کے بعد تذکرے کی بات کریں تو پروفیسر محمود الٰہی نے میر تقی میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' کے ایک نسخے کو پیرس کے قومی کتب خانے سے حاصل کرکے اس کے اصل متن کو ترتیب دیا۔ اس نسخے کا عکس ان کے دوست مرزا سعید الظفر چغتائی کی مدد سے ملا۔ محمود الٰہی نے اپنے بنائے گئے طریقہ کار پر تذکرہ 'نکات الشعرا' کو ترتیب دے کر اصل متن پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس طرح تذکرہ 'نکات الشعرا' جو کافی اہمیت کا حامل ہے اس کی اصل شکل پیش کرکے محمود الٰہی نے کافی اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی 'تذکرہ شورش' (رموز الشعرا) کا قدیم نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور سے حاصل کرکے ۱۹۸۴ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے شائع کیا جو ایک بڑا کارنامہ ہے۔ تذکرہ شورش ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے کہ یہ عظیم آباد کے شعرا کا پہلا تذکرہ ہے جس میں ۲۶۳ شعرا کا تذکرہ شامل ہے۔

مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ 'صحیفۂ محبت' کو محمود الٰہی نے ترتیب دے کر ۱۹۶۴ء میں ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جنھیں مہدی افادی نے اپنی بیگم عزیز النسا (مہدی بیگم) کے نام لکھا تھا۔ ان میں ادبیت اس قدر ہے کہ یہ ایک عظیم ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مکتوب نگاری میں مہدی افادی شبلی کے رنگ کے مداح اور انھیں کے پیروکار تھے۔ وہ اپنے خطوط میں مکتوب الیہ کی ذات کو زیادہ توجہ کا مرکز بناتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ توجہ حسن بیان اور ادیبانہ شان پر دیتے ہیں۔ ان کے کم و بیش ہر خط میں ادبیت کی چاشنی موجود رہتی ہے اور وہ اپنے مخصوص اسلوب بیان کی وجہ سے ہمیشہ قارئین کی دلچسپی کا مرکز بنے رہیں گے۔ وہ حسن پرست تھے اور ان کا ادبی ذوق رچا ہوا تھا۔

ادبی خدمات کے ساتھ دیگر خدمات پر نظر ڈالیں تو انھوں نے کئی اہم کارنامے انجام دئے ہیں۔ ان کا ایک اہم کام گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کو ابتدائی دور سے ترویج و ترقی دینا ہے۔ جہاں انھوں نے اردو میں بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کے کورس شروع کئے اور ایسے باصلاحیت افراد کی تربیت کی کہ آج ان میں سے کئی ہندوستان کی اہم یونیورسٹیوں میں اردو کے اہم عہدوں پر فائز ہو کر اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اردو دنیا میں اتر پردیش اردو اکادمی نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ سبھی پر عیاں ہے۔ وہاں کی نصابی کتابیں اردو حلقے میں نہایت ہی مقبول ہیں مگر ان کتابوں کو منظر عام پر لانے اور اتر پردیش اردو اکادمی کو ترقی دینے والی شخصیت کی بات کریں تو وہ پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت ہی ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین کی حیثیت سے چھ سال تک اردو کی ترویج و ترقی کرتے رہے۔ اپنے دور میں اردو کے نصابی اور کلاسیکی کتابوں پر کافی اہم کام انجام دیا۔ نہایت سستی اور اچھی کتابوں کو منظر عام پر لائے۔ افسانہ، نظم اور غزل کے انتخابات شائع کئے۔ سیکڑوں کتابوں کے جامع مقدمے تحریر کئے۔ یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق کتابوں کو ترتیب دے کر شائع کیا۔ اتر پردیش اردو اکادمی میں جتنا ان کے دور میں کام ہوا اتنا کام شاید ہی کسی کے دور میں ہو سکا۔ یو۔پی اردو اکادمی سے شائع ہونے والے دو رسالے 'اکادمی' لکھنؤ اور 'خبر نامہ' لکھنؤ کے مدیر بھی رہے۔ جس میں ان کے اداریے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی کی انھیں اردو خدمات کے اعتراف میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے انھیں ۱۹۹۸ء میں 'غالب انعام' برائے اردو نثر سے نوازا۔ پروفیسر محمود الٰہی تین سال تک گورکھپور یونیورسٹی میں ڈین بھی رہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ مدت کے لئے انھوں نے کارگزار وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی۔ کئی بار انھیں باقاعدہ وائس چانسلر کا عہدہ قبول کرنے کی پیش کش کی گئی مگر انھوں نے اسے قبول نہ کرکے شعبۂ اردو کی ترقی کو ہی ترجیح دی۔ شعبۂ اردو سے سبکدوشی کے بعد بھی وہ ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تین سال تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسرچ پروجیکٹ پر بھی کام کیا اور آخر کار اردو کی بیش بہا خدمات انجام دے کر ایک طویل علالت کے بعد ۱۹/ مارچ ۲۰۱۴ء بروز بدھ اس اردو دنیا کو تشنہ چھوڑ گئے۔

پروفیسر محمود الٰہی، سادہ پوشش والے، عجیب قلندر مزاج، جاہ و منصب سے بے نیاز انسان تھے جس کی مثال اب شاید دور دور تک نہ مل سکے۔ وہ ملک کے سیکولر نظام کے حامیوں میں رہے ہیں اپنا سیاسی نقطۂ نظر اسی بنیاد پر قائم رکھا۔ ملک کے بیشتر ارباب سیاست بھی پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے۔ غرض بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا والی بات ان پر صادق آتی ہے:

ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر
کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

□□□

پروفیسر محمود الٰہی 'پیش لفظ' کی روشنی میں

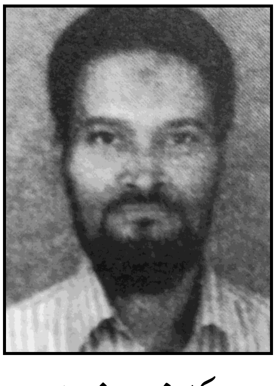

ڈاکٹر رضوان انصاری

120، گاندھی نگر

سدھولی، سیتاپور

رابطہ: 9918443200

پروفیسر محمود الٰہی اردو ادب کے معروف ناقد اور محقق ہوئے ہیں۔ انکا آبائی وطن قصبہ ٹانڈہ (امبیڈکر نگر) ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد پی ایچ ڈی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مکمل کی۔ انہوں نے اپنا مقالہ پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں لکھا۔ ان کے مقالہ کا موضوع 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی سے اپنے مستقبل کے عزائم اور مالی وسائل کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

'میں اس حقیقت کا اعتراف کھل کر کرنا چاہتا ہوں کہ اگر پروفیسر رشید احمد صدیقی میری دستگری نہ کرتے تو مجھے نہ تو زبان و ادب کی خدمت کا موقع ملتا اور نہ یہ مادی سہولتیں ہی نصیب ہوتیں۔ میرے وسائل افسوس ناک حد تک کم تھے اور میرے عزائم لامحدود۔ میں نے ایم اے کے امتحان میں کامیاب حاصل کرنے کے بعد کسی رسمی تعارف کے بغیر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سامنے اپنے مسائل رکھے۔ انہوں نے مجھے فوراً علی گڑھ بلا لیا اور فیلوشپ دے دی۔ ان کے اس کرم نے میری دنیا بدل دی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں معنی لفظ آدمیت کا شکریہ ادا کر سکوں۔'

(پیش لفظ، اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ص ۱۰)

پروفیسر محمود الٰہی گورکھپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ پوری زندگی اسی یورنیوسٹی میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ بے شمار شاگرد موجود ہیں جن کی ذہنی تربیت آپ نے فرمائی اور وہ اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ راقم الحروف بھی پروفیسر موصوف کی خدمتمیں تحقیق کے سلسلہ میں حاضر ہونے کا شرف رکھتا ہے مگر افسوس آپ نے مجھے اپنی خدمت میں قبول نہ فرمایا۔ اصل میں بہت بڑے ناقد و محقق تھے جن کا جائزہ ان کی تحریروں کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی ایک بہت فعال شخصیت کے حامل تھے۔ وہ اتر پردیش اردو اکادمی کے تین مرتبہ چیئرمین ہوئے۔ اس دوران آپ نے اردو کی متعدد کتابوں پر مقدمے تحریر کئے ہیں۔ خاص طور پر مولانا آزاد صدی کے موقع پر جو اکادمی نے ان کی شخصیت اور کارنامے پر مشتمل کتب و جرائد یعنی الہلال و البلاغ شائع کئے ہیں۔ ان پر بڑا پر مغز مقدمہ لکھا ہے۔ آیئے چند مقدمہ/ پیش لفظ پر نظر ڈالتے چلیں:

مرزا یگانہ چنگیزی لکھنؤ دبستان ادب کے شاعر نہیں تھے۔ یہ ۱۸۸۴ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد متعدد مقامات کی سیر کے بعد ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آ گئے۔ یہیں ۱۹۱۳ء میں شادی کی اور ۴؍فروری ۱۹۵۶ء کو دارِ جاودانی کوچ کیا۔

شعراء و دبستان لکھنؤ سے ان کے زبردست معرکے رہے۔ ڈاکٹر انیس اشفاق نے مرزا یگانہ چنگیزی کے کلام کا انتخاب پیش کی جس کو ۱۹۸۸ء میں اردو اکادمی نے شائع کیا۔ اس پر ڈاکٹر محمود الٰہی نے پیش لفظ لکھا تھا۔ اس متنازع شاعر پر بڑی علمی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'یاس یگانہ چنگیزی.... یہ مختلف مظاہر ہیں۔ ایک ایسے شاعر جو خود ہی اپنی منزل کا راہبر بھی، راہی بھی، کا مصداق تھا۔ یگانہ شعر و ادب کی حقیقتوں سے ٹکرا سکتے تھے۔ انہیں شکست و ریخت کی وادیوں میں پہنچا سکتے تھے۔ مگر زندگی کی حقیقتوں نے جب انہیں آئینہ دکھایا تو بیک وقت ان کی شاعرانہ بصیرت پر بھی ضرب پڑی اور ان کی انائیت کے شیش محل پر بھی مگر انہیں گر کر سنبھلنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بھی حلقۂ تجسس سے باہر نہیں ہوتے تھے۔ ان کے اسی سلیقہ نے اردو غزل کو بعض ایسی قدریں عطا کیں جو اس صنف کی حیات نو کا محرک ثابت ہوئیں۔'

(پیش لفظ، ص ۳، ۱۰؍جنوری ۱۹۸۸ء)

جیسا کہ دانشوران ادب بخوبی واقف ہیں کہ اردو زبان کی آبیاری ہر قوم نے مل کر کی ہے۔ اس کا تعلق کسی ذات یا قوم سے نہیں۔ لکھنؤ دبستان شاعری میں دیا شنکر نسیم اور نوبت رائے نظرؔ جیسے بالغ فکر و شعور کے حامل شعراء و ادباء نے اس دبستان کو مثالی بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ نوبت رائے نظرؔ کی کلیات انوار نظر نام سے منشی دیا نرائن نگم نے مرتب کیا تھا جس کی اشاعت یوپی اردو اکادمی نے جنوری ۱۹۸۸ء میں کیا جس کا پیش لفظ ڈاکٹر محمود الٰہی نے بحیثیت چیئرمین تحریر کیا تھا۔ نظرؔ صاحب پر تبصرہ دیکھئے:

'منشی نوبت رائے نظرؔ ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے لکھنؤ کے دبستان شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ انہوں نے نہ تو طریقہ راسخہ قدماء کو حرف غلط سے تعبیر کیا اور نہ اس شعری اور ادبی انقلاب سے منھ موڑا جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد رونما ہوا۔ انہوں نے ایک طرف لکھنؤ کے اساتذۂ فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور دوسری طرف ان اصحاب علم سے خصوصی ربط قائم کیا جو نئے خیالات و نظریات کو عام کر رہے تھے۔

نظرؔ کی شاعری قدیم و جدید کی حسین سنگم ہے۔ وہ ہر اس بات کا خیر مقدم کرتے ہیں جس میں زندگی کی حرکت و حرارت ہو اور جو شعر و ادب کو بالیدگی عطا کرتی ہو۔

نظرؔ نے صرف شاعری کو اپنا ذریعۂ اظہار نہیں بنایا۔ وہ صحافی بھی تھے اور عصری ادب کے نقاد بھی۔ انہوں نے مختلف جریدوں میں کام کیا اور ہر جریدے کو اپنے زورِ قلم سے وقار بخشا۔'

(پیش لفظ، ص ۵، ۲۶؍نومبر ۱۹۸۷ء)

علی جواد زیدی اردو کے بہت نامور ناقد، محقق اور خاکہ نگار ہوئے ہیں۔ وہ ملک کی آزادی کے عینی شاہد تھے۔ وہ انقلابی شاعر بھی تھے۔ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ خاکہ نگاری بہت اہم صنف ہے۔ بڑی باریک بینی درکار ہوتی ہے۔ علی جواد زیدی کا مطالعہ بڑا وسیع اور مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ جس کا خاکہ پیش کرتے اس کا خد و خال اور حرکات و سکنات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے۔

اگر پروفیسر محمود الٰہی کے تمام پیش لفظ اور دیباچوں کو زیر بحث لا کر اظہار خیال کیا جائے تو یہ مقالہ بڑا تفصیلی ہو جائے گا۔ اس لئے اختصار کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ مولانا آزاد صدی کے موقع پر پرفیسر عبدالقوی دسنوی کی کتاب، جو اشاریہ پر مشتمل ہے، شائع کی گئی۔ جس پر محمود الٰہی نے پیش لفظ کے عنوان سے اظہار خیال یوں فرمایا:

مولانا ابوالکلام آزادؔ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ منصفانہ انداز میں بھی اور حریفات عوامل کے تحت بھی لیکن اس مواد کا بڑا حصہ نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اگر کوئی مولانا آزادؔ کے فکر و فن کے کسی پہلو پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نئے موضوع پر کوئی نئی بات کہہ رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی یہ تحریر تحصیل حاصل کے ذیل میں آ گئی ہے۔

تحقیق و تنقید کے مبادیات میں ایہ امر شامل ہے کہ متعلقہ موضوع پر جو مواد دستیاب ہے، اس کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیا جائے جس کے بعد اظہار رائے کیا جائے۔ یادگار آزادؔ کی ترتیب اور اس کی اشاعت اس مقصد کی تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے۔'

(پیش لفظ، ص ۳، ۲؍اکتوبر ۱۹۸۸ء)

□□□

باب سوم

غزلیں

محبت کوئی گناہ نہیں

تیرے کرم کی جو مجھ پر کوئی نگاہ نہیں
تو پھر جہاں میں کہیں بھی مجھے پناہ نہیں

جگر میں درد نہیں، لبوں میں آہ نہیں
نہ جانے کس لئے اب مجھ کو تیری چاہ نہیں

میں اُن کے حسن تخیل پہ لاکھ بار نثار
جو کہہ رہے ہیں محبت کوئی گناہ نہیں

گلوں میں تاروں میں شمس وقمر میں شبنم میں
کہاں کہاں تیری دنیا میں جلوہ گاہ نہیں

تمہاری انجمن ناز سے جدا ہوکر
قسم خدا کی کہیں بھی مجھے پناہ نہیں

کمی سی دردِ محبت میں ہوچکی ہے میرے
نگاہِ حسن جو پہلی سی اب نگاہ نہیں

جنون شوق کی حد سے گزر چکا ہے مگر
یہ بات کیا ہے کہ زخمی ابھی تباہ نہیں

انگڑائی

جنوں پہ رنگ چڑھا شیطنت پہ رعنائی
نظام دہر نے چپکے سے لی جو انگڑائی

مرے خلاف یہ دنیا کی رزم آرائی
کہیں نہ چھوڑوں میں دامنِ شکیبائی

اگر ہے فطرتِ ساقی یہی ستم زائی
اجاڑ دیں گے کبھی میکدہ کو صہبائی

جو کہہ رہے تھے ہوئی ختم رسم ناز و نیاز
انہوں نے دی ہے ہمیں دعوتِ جبیں سائی

یہیں تو جام بھریں گے مرے خوں سے
ز ہے نصیب کہ منزل مری نظر آئی

بساط نو مرے ہاتھوں الٹ نہ جائے کہیں
مجھے جو عہد گزشتہ کی اپنے یاد آئی

فدائے سازِ شہنشاہیت کو کیا معلوم
بغاوتوں کی کہیں بج رہی ہے شہنائی

جنونِ محبت

غمِ دل سنانے کو جی چاہتا ہے
تمہیں بھی رُلانے کو جی چاہتا ہے

سراپا الم ہے مری زندگانی
مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے

جسے سُنکے عرش بریں جھوم اُٹھے
وہ نغمہ سُنانے کو جی چاہتا ہے

مہ و مہر کو انجم و کہکشاں کو
زمیں پر بچھانے کو جی چاہتا ہے

یہ انساں کے ظلم و ستم دیکھ کر اب
قیامت اُٹھانے کو جی چاہتا ہے

یہ زخمیؔ ''جنونِ محبت'' تو دیکھو
انہیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے

محسوسات

میرا دل ان دنوں گھبرا رہا ہے
کوئی رہ رہ کے پھر یاد آ رہا ہے

وہ جلوہ اس طرح دکھلا رہا ہے
کہ ضبط و ہوش کو غش آ رہا ہے

ہٹا کر گیسوؤں کو رُخ سے کوئی
فضا میں برق سی چمکا رہا ہے

قیامت آنے والی ہے جہاں میں
نقاب رخ کوئی سرکا رہا ہے

وہی ظالم سکونِ قلب و دل ہے
دلِ زخمیؔ کو جو تڑپا رہا ہے

محسوسات

جب کبھی ہوتا ہے انساں آپ اپنا آشنا
ایک عالم سر بسجدہ ایک دنیا آشنا

وہ زلیخا ہو کہ یوسف آپ ہوں یا میر ہو
چاک دامانی کا قصہ آشنا نا آشنا

ایک وہ کہ واہے جنکے واسطے آغوش ماہ
ایک ہم کہ تم کو بھی سمجھے وفا نا آشنا

یہ تو اپنا اپنا ظرف تشنگی ہے ورنہ یاں
قطرہ قطرہ بے مروت دریا دریا نا آشنا

جشن غالب سے زمانہ پر یہ عقدہ تو کھلا
آشنائے دوش ہم، طالب تھا فرداً آشنا

بنکر

میرا یہ ہاتھ کہ جس سے تمہیں خط لکھتا ہوں
چلے کر گھے پہ تو اس کو ید بیضا کہئے

چھوے جیکارٹ تو بہزاد سے کیجئے تعبیر
خام ریشم پہ پڑے تو دم عیسیٰ کہئے

مصر پہونچے تو یہی دامن یوسف ہوکر
دست بازوئے زلیخا کی تمنا بن جائے

گیروا چیر بنے بن میں یہ سیتا جی کا
نجد پہنچے تو نقاب رخ لیلیٰ بن جائے

کیا بتاؤں کہ میرے ہاتھ میں کیا بیت گئی
اک ہوا ایسی چلی وقت کے چنگیزوں نے

میرے ہاتھوں سے تمنائی کا رس چوس لیا
باغ باں بن کے اٹھے اور چمن لوٹ لیا

آڑھتی جو میری تخلیق کا سودائی تھا
ایک بے جان سی تصویر نظر آتا ہے

چوٹ تو مجھ پر پڑی درد اٹھا کس کس کے
جس کو دیکھو وہی دلگیر نظر آتا ہے

باب چہارم

تاثرات

پروفیسر محمود الٰہی: اردو کے مجاہد

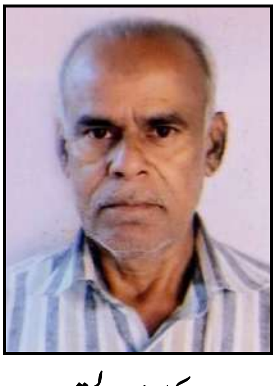

ڈاکٹر انعام الحق

دریا چک، گورکھپور

رابطہ: 8795649426

خالق کائنات جب کسی کو نوازنا چاہتا ہے تو ایسی تدبیر پیدا کر دیتا ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کچھ اسی طرح کی داستان پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی ہے۔ وہ خود رقمطراز ہیں:

’نومبر ۱۹۵۷ء میں مجھے کچھ سخت قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی مہینے میری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فیلوشپ ختم ہو رہی تھی اور میں پی ایچ ڈی کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ جمع کرنے جا رہا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے یا تو فیلوشپ میں توسیع کرا لیتا یا مقالہ داخل کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور گھر چلا آیا۔‘

لیکن اسی درمیان پبلک سروس کمیشن سے اطلاع ملی کہ موصوف کا سلیکشن رام پور میں ہو گیا۔ یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ ایسے شخص کو جسے بے روزگاری کا احساس ہو اور روزگار کی خوش خبری مل جائے تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگے گا۔ ۱۹۵۸ء کے ماہ جنوری میں رام پور پہنچ کر برسر روزگار ہوئے اور ادبی شخصیتوں سے مذاکرات و مباحثہ کر کے علمی پختگی کی طرف گامزن بھی۔ آٹھ ماہ کی مدت یوں گزری کہ پتہ ہی نہ چلا لیکن شفیق استاد پروفیسر آل احمد سرور کی رائے شامل حال ہوئی۔ انہوں نے الٰہی صاحب کے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے ان کے قوت تخیل، کام کرنے کی لگن اور مضبوط ارادے سے متاثر ہو کر ان کا انتخاب گورکھپور یونیورسٹی کے لئے کر دیا۔ استاد کا حکم محترم موصوف نے اپنے لئے فلاح و برکت کا خزینہ سمجھ کر قبول کیا۔ البتہ چند دنوں کی رام پور کے ادبی نصاب کی انسیت و محبت غالب آ رہی تھی۔

خود رقمطراز ہیں:

’مجھے جو ادبی محفل رام پور میں ملی تھی اسے چھوڑنا تو نہیں چاہتا تھا۔‘

لیکن حکم استاد اور مستقبل میں ترقی کرنے کی چاہت نے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ یہاں انہیں سنگلاخ زمین ملی، اسے زرخیز بنانے میں سخت آزمائش سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس کے لئے انہیں تیشۂ فرہاد کی ضرورت بھی تھی اور ریگستان میں مجنوں کی طرح صحرا نوردی کی ضرورت کا احساس بھی تھا

مگر موصوف کے استقلال اور عمل پیہم نے اس راہ پر چلنے میں خود آسانیاں فراہم کرلیں۔

ستمبر ۱۹۵۸ء میں گورکھپور یونیورسٹی میں تقرری ہوئی اور نومبر ۱۹۵۸ء میں جوائننگ، اتنے قلیل عرصہ یعنی نومبر ۱۹۵۷ء میں تھیسس جمع کرنا، رام پور میں جوائنگ اور درس و تدریس کا مرحلہ اور نومبر ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہونا خدا کی طرف سے انعام ہی تھا۔

صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے عہدہ سنبھالتے ہی کام شروع کردیا۔ ابتدا میں طلبا کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اپنی کوششوں سے دوسرے مضامین منتخب کرنے والے طلباء کو اردو مضامین سے رغبت دلائی اور شعبۂ میں ایسے طلباء کا داخلہ کرکے اس میں اضافہ کیا۔ اس طرح شعبہ میں چہل پہل شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شعبہ کو اس کا اصل حق دلانے میں دن رات کوشاں رہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا۔ وی سی سے تعلق پیدا کرنا شعبہ کی ترقی کی ضامن تھی۔ الٰہی صاحب نے اپنا رشتہ دیگر شعبوں کے سربراہوں سے بھی قائم رکھا۔ پوری یونیورسٹی ان کی گرویدہ تھی، وائس چانسلر بی این جھا نے الٰہی صاحب کی دل کھول کر تعریف کی۔ یہ ان کی محنت شاقہ ہی تھی کہ شعبہ کے دس سال پورا ہونے پر غالب صدی پروگرام منعقد کیا۔ اس سے شعبۂ اردو کی مقبولیت یوپی میں ہی نہیں ہندوستان کی دیگر یورنیوسٹیوں میں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے، وہاں تک پہنچی۔ اس طرح شعبۂ اردو نے اپنی موجودگی کا پرچم گاڑ دیا۔

خود وائس چانسلر بی این جھا صاحب شعبۂ اردو کے اس پروگرام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہندی اردو کے تقابل سے انہیں کہنا پڑا:

’کچھ دنوں سے ہندی اور اردو والوں میں ایک بہت تباہ کن جذبہ پرورش پا رہا ہے اور وہ یہ کہ ہندی والے احساس برتری اور اردو والے احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور ان سے دونوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔‘

ڈاکٹر فضل حق اور ڈاکٹر عبدالحق دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر انصار اللہ نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کچھ دنوں تک گورکھپور یونیورسٹی اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی اور ڈاکٹر احمر لاری، ڈاکٹر اختر بستوی اور ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے گورکھپور یونیورسٹی میں ڈاکٹر فضل امام الہ آباد، ڈاکٹر فیروز احمد جے پور، ڈاکٹر قاضی افضال اور ڈاکٹر قاضی جمال نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی کام بخوبی انجام دیا۔ اسی طرح الٰہی صاحب کی سرپرستی میں ۳۶ تحقیقی مقالے لکھے گئے اور ایک ڈی لٹ کے لئے۔ یہ بہت بڑی فہرست اردو ادب کے ذخیرہ میں تھی۔ الٰہی صاحب کو گورکھپور یونیورسٹی میں جن دردانگیز حالات کا مقابلہ کرنا پڑا، اسے بھی نظرانداز کرنا ان کی ہمت و استقلال سے ناانصافی ہوگی۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اقبال کے اس شعر نے جذبۂ توانائی بخشی، ان صعوبتوں، مصیبتوں اور پریشانیوں نے انہیں حوصلہ دیا جسے انہوں نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ بی اے کلاسیز ماہ ستمبر میں شروع ہو گئے لیکن ایک احساس تھا کہ رام پور میں بنی بنائی لہلہاتی کھیتی ملی تھی لیکن یہاں اینٹ و پتھر سے بھری سنگلاخ بنجر زمین لیکن اپنی محنت ولگن سے کام میں لگ گئے۔ طالب علموں کو حوصلہ بخشا، ادب نواز لوگوں سے رابطہ پیدا کیا، یونیورسٹی کی انتظامیہ اور وائس چانسلر سے تعلق پیدا کیا اور اپنی اور شعبۂ کی بے بضاعتی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ وائس چانسلر سے شعبۂ اردو کی بے سر و سامانی کا رونا روتے رہے۔ انہیں احساس تھا کہ اگر ایم اے اور پی ایچ ڈی کے کلاسیز نہیں کھلے تو میرا یہاں آنا بیکار ہوجائے گا۔ نہ ہی شعبہ کی عمارت تھی اور نہ ہی کلاس روم۔ آرٹ فیکلٹی میں کسی شعبہ کا لیکچر روم خالی ملتا تو وہاں درس و تدریس کا کام شروع کردیا جاتا۔ وی سی کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ایم اے کلاسیز کو شروع کرنے سے پہلے کم از کم اس قسم کے انتظام ہونے چاہئے۔

الٰہی صاحب کے تدبر نے کام کیا۔ فضل حق کا ریسرچ فارم اس ریمارکس کے ساتھ وی سی کو دیا کہ اس میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ وی سی کو اجازت دینی پڑی۔ چنانچہ گوکھپور یونیورسٹی میں ایم اے سے پہلے ریسرچ کے لئے منظوری مل گئی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ محترم موصوف نے بھی چین کی سانس لی کہ مشن کا پہلا قدم کامیابی کی طرف اٹھ گیا۔ اس کے بعد ایم اے کے درجات کھلنے میں آسانی ہوئی۔

دوسری ضرورت اچھے اساتذہ کی تلاش تھی اس میں بھی کامیابی ملی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی اور ملک زادہ منظور احمد اور ڈاکٹر احمد لاری نے ان ضرورتوں کو پورا کیا۔ درسی کتابوں اور تحقیقی کتابوں کی ضرورتوں کا بھی احساس تھا، اسے بھی پورا کیا۔ الٰہی صاحب کی تعلیم و تربیت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان میں آل احمد سرور اور پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن کے نام

نامی شامل ہیں۔ یہ ایسی شخصیتیں ہیں جنہیں ادب کا ستون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان لوگوں نے جس شجر کی آبیاری کی تھی، اسے تناور درخت بننے میں دیر نہیں لگی اور ایسا تناور درخت کہ اس کے پھول و پھل سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے۔ ان کے اندر جو سب سے بڑی خوبی تھی وہ یہ کہ اپنے کسی طالب علم سے غافل نہ رہتے۔ ان کا طالب علموں کے ساتھ تدریسی تعلق ڈائیلاگ یعنی لیکچر ہوتا تھا۔ یعنی نوٹس کو کبھی ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا۔ وہ بی اے یا ایم اے کے کلاس لیتے تو اپنے طالب علموں سے کہتے کہ اگر تمہیں کوئی مقام حاصل کرنا ہے تو کتابوں کا مطالعہ کرو چاہے وہ ناول ہو یا افسانہ۔ جو پسندیدہ موضوع ہو جس سے رغبت ہو اسے اپنے مطالعہ میں رکھو خود بخود تمہیں راستہ مل جائے گا۔

مجھے ان کے انداز بیان کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ میرا داخلہ ریسرچ کے لئے ہو چکا تھا اور میں شعبہ کی طرف ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ اسی درمیان میری نظر الٰہی صاحب پر پڑ گئی۔ ریسرچ اسکالروں کی یہ عادت تھی کہ جب صدر شعبہ کو دیکھتے تھے تو ان کے پیچھے قدم بہ قدم چلنے لگتے تھے۔ اس سے ان کو بہت کچھ حاصل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اتنی اچھی مفید باتیں علم میں آتیں کہ حیرت ہوتی اور ذہن و دماغ میں ازبر ہو جاتیں۔ میں بھی صدر موصوف کے پیچھے لگ گیا اس دن اتفاق کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا ریسرچ اسکالر نہیں تھا۔ یہاں تک کہ شعبہ آ گیا۔ میں نے چابھی کا گچھا ان کے ہاتھ سے لے کر کمرہ کھولنے لگا۔ اسی درمیان انہوں نے یہ شعر پڑھا:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ کچھ سمجھ میں آیا۔ میں نے، نہ سمجھتے ہوئے کہا کہ ہاں اور اس شعر پر غور کرنے لگا کہ کہیں کوئی اور معنی پوشیدہ تو نہیں۔ لیکن الٰہی صاحب پھر گویا ہوئے: میں تم لوگوں کو ایسا ہی بنانا چاہتا ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے طالب علم مخاطب کو اپنے جواب سے ایسا مطمئن کر دیں کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ کسی ایسے جوہری کا تراشا ہوا ہے جس میں کوئی عیب نہیں لگا سکتا۔

الٰہی صاحب گورکھپور رہتے ہوئے قرب و جوار کے بہت سے ڈگری کالجیز میں جہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد تھی، شعبۂ اردو قائم کرایا۔ اس کے لئے جو بھی اس کالج کو آسانیاں چاہئے تھیں، فراہم کرائیں۔ ڈاکٹر شکیل صاحب 'سمٹا سائبان' میں ان کی فکرمندی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

'کالج کے الحاق کے سلسلہ میں آپ یونیورسٹی کی طرف سے آپ جس کالج میں بحیثیت معائنہ کار تشریف لے جاتے وہاں کے منیجر کو مہمیز کرتے کہ کالج میں اردو مضمون کی تعلیم کو بھی دیگر مضامین کے ساتھ شامل کر دیں تو اپنی رپورٹ میں نرم گوشہ رکھیں گے۔'

اپنی نگرانی میں ریسرچ اسکالروں کے تحقیقی کام کو مکمل کراتے، انہیں اساتذہ کی فہرست میں داخل کرتے اور ان کی یونیورسٹی سے ملحق کالجوں میں لیکچررشپ کے عہدے پر فائز کرتے اور ان کی کارکردگی صلاحیت وشعور کو جانچتے پرکھتے۔ جب تک مطمئن نہ ہوتے، مطالعہ کی تلقین کیا کرتے۔ اس طرح استاد اور شاگرد کا رشتہ اتنا استواریت کو پہنچا کہ ان کے شاگردان سے کتنا ہی دور رہتے، کسی بھی موضوع پر ضرورت ہوتی تو رابطہ ضرور پیدا کرتے۔ اگر کبھی گورکھپور آتے تو ان کے حضور میں بغیر حاضری دئے ان کا گورکھپور کا دورہ مکمل نہیں ہوتا۔

آپ کی علمی لیاقت، دانشمندانہ رویئے نے وہ عزت وتوقیر بخشی کہ وقفہ وقفہ کے درمیان ڈین فیکلٹی آف آرٹ لائبریرین، وائس چانسلر اور اردو اکادمی کے تین مرتبہ چیئرمین کے عہدے پر رہنے کا موقع ملا۔ اردو اکادمی میں رہتے ہوئے بہت بڑا کام ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کے شائع شدہ شماروں کو تلاش کر کے تین جلدوں میں کم قیمت پر شائع کیا تا کہ ان شماروں سے ایسے شائقین بھی سیراب ہو سکیں جنہیں الہلال اور البلاغ کے کچھ شمارے ہی دستیاب ہوئے جن کی خواہش بے چین کر رہی تھی اس کی بازیابی کی، ان کے لئے تین جلدیں جس میں الٰہی صاحب نے مبسوط مقدمہ بھی لکھا، نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ آپ کی بے شمار تحریریں صفحۂ قرطاس پر بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابوں کو مرتب کر کے اس پر مبسوط مقدمہ لکھے جن میں صحیفۂ محبت، اردو کا پہلا ناول خط تقدیر، تذکرہ نکات الشعراء، اردو قصیدہ نگاری کا جائزہ، فسانہ عجائب کا بنیادی متن، تذکرۂ شورش، انتخاب خطبات خلافت، انتخاب ہفتہ وار پیغام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار کتابوں کے پیش لفظ لکھے ہیں۔ طنزیہ کالم بھی لکھے ہیں۔ اس میں رانی کیتکی کا طنزیہ کالم 'مقطع میں آن پڑی ہے.....' پڑھنے کے لائق ہے۔ ان طنزیہ کالوں میں الٰہی صاحب اردو کی موجودہ اور آنے والی پیڑھیوں کا ذکر کر کے کف افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

❑❑❑

ایک شفیق استاد؛ پروفیسر محمود الٰہی

ڈاکٹر ذاکر حسین

شانتی نگر وارڈ، وارڈ نمبر ۷
نزد سنت پشپا اسکول، دیوریا
رابطہ: 6394171473

مرے بے جان ہونٹوں نے جو پائی تاب گویائی
'اُسی' عیسیٰ نفس کا ہے یہ اعجاز مسیحائی
(اختر بستوی)

پروفیسر محمود الٰہی لیجنڈ تھے۔ وہ ایک شفیق استاد تھے۔ وہ ایک معتبر محقق تھے۔ وہ ایک بڑے نقاد تھے۔ ان کی تنقیدی بصیرت ہندی شاعر بہاریؔ کے دوہوں جیسی تھی جو اندرون خانۂ دل کو گھائل کرتے ہیں۔ وہ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ کسی موضوع پر اپنا قلم اٹھاتے تو اس کی گہرائی تک پہنچ کر قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ موضوعات کا سمدر سمندر منتھن کرتے اور پھر اس میں سے امرت اور وش کو الگ الگ کرتے۔ مثلاً امتیاز علی تاج کے ڈرامہ انارکلی کا انھوں نے جو تجزیہ کیا ہے وہ اردو تنقید کا حرف آخر ہے۔ اس موضوع پر آپ چاہے جتنا لکھتے رہئے اس بلندی تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اسی طرح غالب کا سفر کلکتہ، لکھنؤ اسکول اور قصیدہ نگاری، کربل کتھا، احتشام حسین بحیثیت نقاد، طبقات شعرئے ہند یہ ایسے تنقیدی اثاثے ہیں جو اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ الہلال پر ان کا مقدمہ ۷۰ رصفحات پر محیط ہے۔ کربل کتھا پر ان کا تحقیقی مضمون ادب میں نئے اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور زخمی تخلص کرتے تھے۔ جب ان کی زندگی سخت، دشوار اور خاردار راہوں سے ہم کنار ہونے لگی تو انھوں نے شاعری کے نرم گوشوں ملائم و نازک ترکیبوں، سنہرے خوابوں اور حسن و عشق کی پرفریب گلیوں میں سیر کرنا کب ترک کر دیا، اس کا صحیح اندازہ ان کو بھی نہیں تھا۔ بعد کی زندگی میں جب انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے شانے پر گیسوئے اردو کو طویل اور دلفریب بنانے کی ذمہ داری ہے تو انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس بات کو ان کی بیٹی ڈاکٹر زیبا محمود زیادہ موثر انداز میں کہتی ہیں ''ایک مدرس، ایک مبلغ، ایک محقق، ایک نقاد ایک دانشور کی حیثیت سے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ اردو ادب کی تاریخ میں بے بدل ہے۔' (بازیافت مرتب ڈاکٹر زیبا محمود۔ ص۔23 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔1994)

محمود الٰہی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے گورکھپور یونیورسٹی میں اردو کا دیوہیکل ستون کھڑا کیا۔انہوں نے اپنے خون جگر سے گورکھپور یونی ورسیٹی کے شعبہ اردو کی آبیاری کی۔جب انہوں نے یونیورسیٹی میں اردو کا شمع روشن کی تو وہاں تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔اس مخالف ماحول میں کس جاں سوزی سے انہوں نے اردو کو زندگی عطا کی اسے یونیورسٹی کے اسسٹنٹ لائبریرین مصطفی کمال اچھی طرح بتایا کرتے تھے۔پروفیسر محمود الٰہی جب اس دور سے گزر رہے تھے تو ضرور ان کا تحقیقی اور تنقیدی کام متاثر ہوا۔ڈاکٹر زیبا محمود پروفیسر محمود الٰہی کو محقق اور نقاد تک محدود نہیں رکھتی ہیں۔وہ انہیں ایک دانشور مانتی ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ وہ ایک نباض تھے۔''جن کی دور رس نگاہیں اردو کے حال و مستقبل سے باخبر تھیں۔''(بازیافت مرتب ڈاکٹر زیبا محمود۔ص۔22)صرف ان کا تحقیقی اور تنقیدی کام ہی نہیں بلکہ ان کا گھر خاندان بھی متاثر ہوا۔ان کے بچے ان حالات کے سب سے پہلا شکار ہوئے۔ ڈاکٹر زیبا محمود کی تحریروں میں اس درد کا احساس جھلکتا ہے۔

جب پروفیسر محمود الٰہی اردو کی شمع روشن کرنے کے لئے اپنا خون جگر صرف کر رہے تھے تو اس میں ان کی شاعری، تنقید اور ادبی کارنامے جل کر راکھ ہوگئے بچ رہا اردو کا وہ چھتنار درخت جس کے سائے میں سینکڑوں محقق اور ادیب اور شاعر بیٹھ کر شاعری کر رہے ہیں، تنقیدی مضامین لکھ رہے ہیں اور ادب کو فروغ دے رہے ہیں۔ہم ان کے کھاتے میں کئی درجن کتابوں کی فہرست نہیں دیکھ سکتے۔مگر ان کے کھاتے میں کئی درجن شاگردان کے ناموں کی فہرست ضرور دیکھ سکتے ہیں، جن کو انہوں نے ذاتی دلچسپی لیکر اردو کی خدمت کے لئے تیار کیا۔آج وہ آسمان ادب کے درخشندہ ستارے ہیں۔ان کے شاگردان میں ہر ایک کے کھاتے میں ضرور کئی درجن کتابوں کے نام درج ہیں۔ان کے عالمی شہرت یافتہ شاگردوں میں پروفیسر فضل امام، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر احمر لاری، پروفیسر اختر بستوی، پروفیسر افغان اللہ خان، ڈاکٹر موسیٰ مجروح، ڈاکٹر غلام رسول مکرانی، پروفیسر ریاض الدین، پروفیسر غلام حسین کے نام شامل ہیں۔

گورکھپور یونیورسٹی کے ماحول کو دیکھ کر آج بھی ہم استاد محترم کے کام کا تجزیہ کرسکتے ہیں۔مصطفی کمال کے مطابق انہوں نے 1967 میں یونیورسٹی کے میں غالب کے صد سالہ جشن کا اہتمام کیا۔جشن غالب کی یاد گورکھپور یونیورسٹی میں بہت دنوں تک باقی رہی۔پروفیسر محمود الٰہی اکثر اردو کے معروف نقاد اور ڈرامہ نگار محمد حسن کی تعریف میں کہا کرتے تھے کہ وہ ۱۰۰ صفحات کو ایک صفحے میں لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔پروفیسر اختر بستوی کے مطابق محمود الٰہی کے اندر بھی یہی خوبی موجود تھی۔مگر انہوں نے اردو کی تحریری نہیں بلکہ عملی خدمت انجام دی۔ان کے ادبی کارناموں کی فہرست میں گورکھپور یونی ورسیٹی کے شعبہ اردو کی آبیاری اور اردو اکادمی کو عالمی شناخت دلانا شامل کیا جاسکتا ہے۔اتر پردیش اردو اکادمی کو کام کی بنیاد پر محمود الٰہی نے یہ بتایا کہ اکادمیوں کو کیسا ہونا چاہیے۔ان کے کام الہلال اور البلاغ کی تدوین کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے۔محمود الٰہی نے اکادمی کے توسط سے سینکڑوں کی تعداد میں نادر مخطوطوں و قلمی نسخوں اور لائبریریوں سے غائب ہوچکی کتابوں کی اشاعت نو کرا کر انہیں نئی زندگی عطا کی۔انہوں نے اکادمی کے ذریعے 80 فیصد سبسڈی نصابی کتابوں کی اشاعت کرائی جس سے اردو کے نادار اور غریب طلبہ نے استفادہ کیا۔یہ نصابی کتابیں نہ صرف یوپی بلکہ پورے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

ممتاز مفتی کی عالمی شہرت یافتہ کہانی ''آپا'' میں آپا کے مرکزی کردار کو اس طرح گڈھا گیا ہے کہ اس کی خاموشی اس کی گویائی بن گئی ہے۔اس کی زبان خاموش رہتی ہے اور اس کے عضو بولتے ہیں۔اس کے عضو اس کے ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔اس کی زبان سے 'ہوں' 'ہاں' 'میں کیا جانوں' کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔اس کردار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ بغیر ایک لفظ بولے ہر جگہ جلوہ گر ہوتی ہے۔کہانی اس کے ارد گرد گھومتی ہے۔اس کے کردار کو دوسرے کرداروں کے سہارے منزہ کیا گیا ہے۔اس کے اندر ایک چنگاری ہے جو ہر وقت روشن رہتی ہے۔آپا کا شخصی تعارف کراتے ہوئے اس کے چھوٹے کمسن بھائی بدو نے کیسی پتے کی بات کہی۔اس نے چولہے پر اپلے کے جلے ہوئے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپا ایسی ہے۔جب یہ بات گھر میں پھیل گئی کہ بدو آپا کو جلے ہوئے اپلے سے تعبیر کر رہا ہے تو گھر میں رہ رہے

پھوپھی زاد نے اس مکالمے کو دوبارہ سننے کی فرمائش کرتے ہوئے بدو سے پوچھا:

''ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟'' وہ بولے۔''بتاؤں ؟''بدو چلایا اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لیکر ہمیں دکھانا چاہتا تھا۔مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی ''اونہہ'' بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں ''پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے اس میں چنگاری ہے'' ''وہ تو جلا ہوا ہے اماں'' بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔اماں بولیں ''میرے لال تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے، اوپر سے نہیں دکھائی دیتی ۔'' بدو بھولے پن سے پوچھا ''کیوں آپا اس میں آگ ہے؟'' اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

('آپا' از ممتاز مفتی ۔بحوالہ اردو کے تیرہ افسانے مرتب اطہر پرویز۔ص 213 ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔اشاعت 1984)

جب میں مجموعی اعتبار سے اپنے شفیق استاد پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ممتاز مفتی کی کہانی ''آپا'' کی بے طرح یاد آتی ہے۔

''آپا'' کی طرح ان کی شخصیت بھی انتہائی دلفریب اور پرکشش تھی۔ان کی خاموشی بولتی تھی۔ان کے اندر ایک باہر سے نہ دکھائی دینے والی آگ تھی جو ہر وقت روشن رہتی تھی، بس اوپر سے نہیں دکھائی دیتی تھی ۔جن لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا وہ اکثر اپنے ہاتھ جلا لیتے۔

اسی لئے ڈاکٹر زیبا کہتی ہیں:

'پروفیسر محمود الٰہی کی زندگی حرکت و عمل سے عبارت تھی۔'

(بازیافت،مرتب ڈاکٹر زیبا محمود ص ۷)

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ وہ ایک شہد کے چھتے کی طرح تھے جس سے طلبہ جتنا چاہے شہد پی سکتے تھے۔میں نے اکثر و بیشتر دیکھا ہے استاد کے مشورے پر جس نے عمل کر لیا وہ اجین، جے پور اور پٹنہ میں ہے جس نے عمل نہیں کیا وہ اونچوا پر پتنگ پیچ رہا ہے یا بسنت پور محلے میں سبزی کی دوکان کھولے بیٹھا ہے۔میں بھی ان میں سے ایک ہوں جس نے استاد کے مشورے پر عمل نہیں کیا اور ہمیشہ ان کو شک کی نظروں سے دیکھا۔آج میری حیثیت تیسرے درجے کی بھی نہیں ہے۔مگر میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ استاد کے مشورے پر بغیر کسی حیل وحجت عمل کیا ہوتا تو میری شخصیت میں کتنا نکھار پیدا ہوا گیا ہوتا ۔میں کوئی خشونت سنگھ نہیں ہوں کہ استاد کے متعلق ان دنوں کی اپنی ذہنی کیفیت کو لکھ سکوں مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوتا تو کیا ہی خوب ہوتا۔

پروفیسر محمود الٰہی ایک بہت اچھے انسان کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ٹیچر بھی تھے۔وہ کبھی کلاس ناغہ نہیں کرتے تھے۔شعبۂ اردو میں طلبہ کی جانب سے جمعہ کو غیر اعلانیہ تعطیل رہتی تھی۔ محمود الٰہی صاحب نے ہمیشہ کوشش کی کہ جمعہ کو بھی کلاس چلے۔اس کے لئے وہ طلبہ کی ذہن سازی کرتے رہتے تھے۔کچھ طلبہ کبھی اگر اس کے لئے تیار ہوجاتے تو دوسرے طلبہ انہیں پکڑ کر کمینٹ کی بوچھار کر دیتے ۔آخر جمعے کو کلاس چلانے والا پروگرام ایک بار پھر منجمد ہو جاتا۔کلاس میں استاد کی شیریں بیانی مشہور تھی۔وہ ایم اے سال اول اور دوم دونوں کے طلبہ کو ایک ایک گھنٹے پڑھاتے تھے۔ان کے پڑھانے کا انداز انتہائی دلچسپ تھا۔ پڑھاتے پڑھاتے جب گھنٹا ختم ہو جاتا تو وہ اٹھ جاتے اور دوسرے تیسرے دن جب بھی کلاس میں آتے اپنی بات وہیں سے شروع کرتے تھے۔ان کی یادداشت کی داد دینی پڑے گی۔نوٹس کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ رہتا۔نوٹس بولتے بولتے بند کر دیتے ۔ جب دوسرے یا تیسرے دن پھر کلاس میں آتے تو آخری لائن سنتے اور پھر وہیں سے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ایسا لگتا جیسے ان کا ذہن پرانے ریکارڈس ہوں ۔ جہاں سوئی رکھی گئی وہیں سے چلنے لگتا تھا۔ان دنوں کمپیوٹر کا تصور نہیں تھا مگر پروفیسر محمود الٰہی کا ذہن کمپیوٹر سے کم نہیں تھا۔ان کو عربی اور فارسی پر یکساں عبور حاصل تھا۔اس لئے ان فکر کافی گہری اور وسیع تھی۔

استاد کا کام ہوتا ہے طلبہ کو اچھا مشورہ دینا اور ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنا۔صحیح معنوں میں طالب علم استاد کا عکس ہوتا ہے۔ایک اچھے استاد کے مشورے طالب علم کے لئے سرمایہ حیات ہوتے ہیں جسے وہ پوری عمر اپنے ذہنوں میں بسائے رہتا ہے اور اس سے مستفیض بھی ہوتا ہے۔محمود الٰہی کی نظریں ایک قابل غوطہ خور جیسی تھیں جو طالب علم کو فوراً پہچان لیتی تھیں۔انہوں نے اپنی چالیس سالہ طویل درس وتدریس کے زمانے میں ایسے بے انتہا طلبہ کو بام عروج پر پہنچایا۔درجنوں طلبہ کو اپنی جیب سے فیس ادا کر کے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور انہیں لکچرار بنانے میں بھی مدد کی۔ایسے میں مجھے امریکہ کے

ہوانہ اسٹیٹ کی ایک اسکول ٹیچر کی یاد آ گئی جسے ایک ہونہار طالبہ نے ضعیفی کی علالت کے موقعے پر محبتوں کا ایسا صلہ دیا کہ وہ حیران رہ گئی۔اس ٹیچر کی ہوانہ کے ایک اسکول میں نئی نئی تقرری ہوئی تھی۔اس نے وہاں دیکھا کہ ایک کمسن طالبہ بہت لگن سے پڑھ رہی ہے بے حد پابند اوقات ہے۔اپنا کام بھی بہت انہاک سے کرتی ہے۔ٹیچر نے نوٹ کیا کہ اس کے جوتے پھٹے ہوئے ہیں اور تنگی کی وجہ سے اس کے والدین اس کے لئے نئے جوتے نہیں خرید پا رہے ہیں۔ٹیچر نے اس غریب طالبہ کو ایک جوڑ چمڑے کے خوبصورت جوتے خرید کر دئے۔اس واقعے کو پروفیسر اطہر صدیقی نے اپنی تازہ کتاب (حیرت سرائے کی کہانیاں۔جلد دوم ص۔142 براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی 2017) میں درج کیا ہے۔

ڈاکٹر مینڈیز کا واقعہ ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ڈاکٹر مینڈیز آگے چل کر بہت بڑی ڈاکٹر بنیں۔انہوں نے اپنے اسکول کی نئی ٹیچر کا دیا ہوا وہ یادگار تحفہ زندگی بھر فراموش نہیں کیا۔ٹیچر نے ڈاکٹر مینڈیز کو وہ قیمتی تحفہ اس وقت دیا تھا جب انہیں اس کی بے حد ضرورت تھی۔اس وقت ڈاکٹر مینڈیز کو اس عنایات کا کوئی مطلب بھلے معلوم نہ ہو مگر وہ اس تحفے کو بھول نہیں پائی۔اس وقت بھی نہیں جب وہ چھوٹی بچی تھی اور اس وقت بھی نہیں جب وہ شہر کے مشہور نرسنگ ہوم کی ڈائریکٹر بن گئی۔واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ ٹیچر ضعیف العمری میں دوران علالت ڈاکٹر مینڈیز کے نرسنگ ہوم میں داخل ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ نرسنگ ہوم میں اس کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔دوسرے مریضوں نے بھی اسے یاد دلایا کہ اس کے ساتھ کچھ غیر معمولی سلوک کیا جا رہا ہے۔جب اس نے نرسوں اور ڈاکٹروں سے اس بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے انہیں خاص طور پر نرسنگ ہوم کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مینڈیز کی طرف سے ہدایت دی گئی ہے۔

صحت یاب ہونے کے بعد اسکول ٹیچر نے ڈاکٹر مینڈیز کا شکریہ ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔اس کے لئے وہ اجازت لے کر ان کے کمرے میں گئی۔ٹیچر نے اپنے سامنے چالیس سال عمر کی ایک خوبصورت عورت کو دیکھا جو ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ٹیچر نے کہا کہ ڈاکٹر آپ نے اپنے نرسنگ ہوم میں میرے ساتھ جو حسن سلوک پیش کیا ہے جو پیار دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اور یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میں کس طرح آپ کو ان عنایات کا بدلہ دے سکتی ہوں۔ڈاکٹر مینڈیز نے کہا کہ آپ مجھے بدلہ دیں گی۔''دراصل میں آپ کو بدلہ دینے کی کوشش کر رہی ہوں''۔ٹیچر حیران تھی کہ ڈاکٹر کس بدل کی بات کر رہی ہیں۔انہوں نے ڈاکٹر مینڈیز سے پوچھا کہ کیا ہم کبھی مل چکے ہیں۔ڈاکٹر مینڈیز نے کہا کہ ٹیچر آپ میرے لئے انسپریشن ہیں۔میرا رول ماڈل ہیں۔آپ ہی نے مجھے سکھایا کہ میں مستقبل میں کیسے اپنی زندگی سنوار سکتی ہوں۔آپ نے میرے اندر جینے کی خواہش پیدا کی اور بتایا کہ حالات کو کیسے اپنے حق میں موڑا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر مینڈیز نے کہا کہ میں اس وقت جیسے بھی ہوں آپ کی وجہ سے ہوں۔آپ کے حوصلے نے مجھے بے انتہا طاقت دی۔آج میں جس مقام پر ہوں اس کا سارا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ٹیچر حیران تھی اس نے کہا کہ ڈاکٹر آپ کیا کہہ رہی ہیں میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔ڈاکٹر مینڈیز نے کہا کہ ٹیچر آپ کو میں یاد نہیں آ رہی ہوں۔مگر میں نے آپ کو ہمیشہ یاد رکھا۔میں آپ کے اسکول میں ایک غریب لڑکی تھی۔آپ نے مجھے ایک جوڑ چمڑے کے خوبصورت جوتے خرید کر دئے تھے۔وہ جوتے میرے لئے دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ ٹیچر اور ڈاکٹر مینڈیز جیسے رشتے والے بہت سارے واقعے پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔کوئی اس کو کھلے عام یاد کرے نہ کرے مگر محمود الٰہی کی زندگی سے کئی ڈاکٹر مینڈیز منسلک ہیں۔اس سلسلے میں مجھے پروفیسر اختر بستوی نے کئی کہانیاں سنائی ہیں۔خود ڈاکٹر اختر بستوی کو محمود الٰہی صاحب نے ایک اسکول سے یونیورسٹی میں پہنچنے کا انسپریشن دیا۔ڈاکٹر اختر بستوی استاد محترم کو شیریں زبان فرشتہ کہا کرتے تھے اور ان کے حکم پر ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔

پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے میری پہلی ملاقات ایم اے میں میرے داخلے کے ساتھ ہوئی تھی۔یہ 1982 کے ستمبر کا واقعہ ہے۔ان دنوں داخلے میں آج جیسی کھینچ تان نہیں ہوتی تھی۔میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر آج جیسی صورت حال ہوتی تو میں ایم اے ہی نہیں کر پاتا۔ستمبر کے مہینے میں جب میں یونی ورسیٹی کے ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ کے کاؤنٹر پر رجوع کیا تو وہاں کہا گیا کہ داخلہ فارم ملنا بند ہو چکے ہیں۔یہ پوچھنے پر کہ اب کیا ہوگا انہوں نے بتایا کہ اگر صدر شعبہ اردو چاہیں تو داخلہ فارم

کے لئے لکھ سکتے ہیں۔جب آرٹ فیکلٹی کے شعبہ اردو میں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب نکل رہے تھے۔شعبہ اردو پروقار آرٹ فیکلٹی کی پہلی منزل پرواقع ہے بالکل شمالی ونگ میں۔اب تو شاید اس ونگ کے سارے کمرے شعبہ اردو کے قبضے میں ہیں۔ان دنوں اس ونگ کے دو کمروں پر شعبہ انگریزی کا قبضہ تھا۔شعبہ اردو کے لئے صرف ایک کمرہ مختص تھا جس میں ایم سال اول کا کلاس چلتا تھا اور اس کے علاوہ چار چھوٹے چھوٹے حجرے تھے جس میں لکچرار ایم اے سکنڈ ایئر کا کلاس لیتے تھے۔ایک مزید حجرہ تھا جس میں دفتر کا کام ہوتا تھا ان دنوں خان صاحب کلرک ہوا کرتے تھے۔ خان صاحب انتہائی خاموش اور بے ضرر قسم کے آدمی تھے یہ بات کئی لوگوں کو اچھی بھی لگتی تھی اور کھٹکتی بھی تھی۔خان صاحب ڈاکٹر اختر بستوی کے صدر شعبہ اردو بننے کے بعد لائبریری میں منتقل ہو گئے۔ڈاکٹر اختر بستوی خان صاحب کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے ۔انہوں نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ کام ہی نہیں کر سکتے۔کچھ سال بعد جب افغان اللہ خان صدر شعبہ اردو ہو گئے تو خان صاحب پھر شعبہ اردو میں رونق افروز ہو گئے۔ایم اے کے طلبہ جب اپنی کلاس مکمل کر لیتے تو اپنے اپنے سپروائزروں کے پاس ریسرچ اسکالرز کا جمع ہو جاتے اور یہ سلسلہ دن میں دو بجے تک جاری رہتا۔ان دنوں پروفیسر محمود الٰہی کے ساتھ ڈاکٹر احمر لاری ڈاکٹر اختر بستوی اور نوجوان لکچرار ڈاکٹر افغان اللہ خان کام کر رہے تھے۔ آج چالیس سال بعد بھی شعبہ اردو کی عمارتی حیثیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔

اس دن جب پروفیسر محمود الٰہی صاحب شعبہ اردو سے نکل کر ۴ر پروفیسر کالونی واقع اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے میں نے راستے میں انہیں پکڑ لیا۔انہوں نے کہا کہ اب تک کہاں تھے۔اب بہت دیر ہو چکی ہے داخلہ نہیں ہوگا۔میں نے بتایا کہ میں نے شبلی کالج سے بی اے کیا ہے اور وہاں کا رزلٹ آنے میں دیر ہو گئی اس لئے میں پہلے نہیں آ سکا۔ڈاکٹر صاحب کسی قیمت پر میری دلیل سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔مگر میں نے تھوڑا تلخی سے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے یونیورسٹی نے رزلٹ ہی دیر سے نکالا ہے۔میں ان کے ساتھ چلتا رہا ۔وہ مجھے کنوینس کرتے رہے اور میں ان سے گزارش کرتا رہا کہ میرا داخلہ کر دیجئے۔جب میں گیٹ تک ان کے ساتھ ہی چلتا رہا تو انہوں نے کہا کہ اچھا خیر کل آیئے۔دسرے دن میں 11 بجے شعبہ اردو پہنچ گیا۔انہوں نے میری درخواست پر ایک فارم دینے کے لئے سفارش کی اور پھر میرا داخلہ ہو گیا۔انہوں نے نہ صرف میرا داخلہ کرایا بلکہ مجھے ہاسٹل بھی دلوایا، جو میرے لئے ان دنوں بہت ضروری تھا۔میں اکثر و بیشتر ہاسٹل سے سائکل اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچ جاتا۔ریسرچ پیریڈ میں تو ان کی قربت سے میں بہت فیض یاب ہونے لگا۔میرے سپروائزر ڈاکٹر اختر بستوی تھے مگر میں الٰہی صاحب سے بھی اسی طرح فیض حاصل کرتا تھا۔میں اکثر ان کے لئے نخاس کی ایک خاص دوکان سے بابا زردہ لایا کرتا تھا۔وہ کبھی کبھی بابا زردہ کی خوبیوں کے متعلق بتایا کرتے تھے۔ان کے لئے گھاسی کٹرہ کے بھورے قصاب کے یہاں سے قیمہ بھی آتا تھا۔اسی طرح وہ لیکٹوجین lectogen دودھ کا پاوڈر استعمال کرتے تھے۔نیسلے کے لیکٹو جین دودھ کے پاوڈر کی بہت سی قسمیں بازار میں تھیں۔اس لئے جب وہ کسی اسٹوڈنٹس سے لیکٹوجین کا ڈبہ طلب کرتے تو پہلے طے شدہ دوکان کے متعلق بتاتے کہ وہیں سے لینا ہے پھر ہدایت دیتے کہ کس برانڈ کا لیکٹوجین لینا ہے ۔میں ان کے ساتھ 1992 تک رہا۔یہ شب و روز ایک سنہرے خواب جیسے تھے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب پروفیسر محمود الٰہی صدر شعبہ اردو تھے۔آرٹ فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔آنریری لائبریرین تھے اور کارگزار وائس چانسلر کے پروقار عہدے پر بھی فائز تھے ۔ایسا کم از کم دو بار ہوا۔جب میرا ریسرچ رجسٹریشن پیریڈ ختم ہو گیا تو اس کے رینیول فارم پر ہیڈ سے لیکر وائس چانسلر تک کے دستخط ہوئے۔یہ ایک صدر شعبہ اردو کے لئے انتہائی فخر کی بات تھی۔ان کے سارے شاگردوں کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ استاد کا گورکھپور یونیورسٹی یا پھر کسی دوسری یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے لئے تقرری ہو جائے مگر ایسا نہ ہونا ہم سب کو بے حد مایوس کر گیا۔استاد محترم کی شفقت اور محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب شعبہ اردو کے لکچرار ڈاکٹر اختر بستوی کو دل کا دورہ پڑا تو انہوں نے خاص طور سے اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں ریلوے اسپتال میں داخل کرایا۔نہ صرف داخل کرایا بلکہ کواباغ واقع ریلوے اسپتال میں روزانہ ان کی عیادت کے لئے جاتے اور ان کی جانچوں اور دواؤں اور دیگر ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود محمود الٰہی صاحب نے اپنی نگرانی میں ان کا علاج کرایا۔

ریلوے اسپتال کے عارضہ قلب کے مشہور معالج ڈاکٹر ویشہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مدراس کے اپولو اسپتال میں ان کی کامیاب بائی باس سرجری ہوئی۔

ڈاکٹر اختر بستوی خود ایک بڑے شاعر اور نقاد تھے۔ان کی لائف اسٹائل ہزاروں میں ایک تھی۔وہ بند گلے کی کاٹن ہی کی شرٹ اور کاٹن ہی کی پینٹ پہنتے تھے۔ان کی شرٹ اور پینٹ کی سلائی بستی کا خاص درزی کرتا تھا۔ایک بات جو ان کی بڑی انوکھی تھی وہ کبھی صابن استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ بیسن ہی سے نہاتے تھے اور بیسن ہی سے ہاتھ دھلتے تھے۔ان کی شخصیت میں اتنا پیچ وخم تھا کہ طلبہ ان کے سحر میں گرفتار رہتے تھے۔ان کی آواز بہت بھاری اور مسحور کن تھی۔جب وہ کلاس میں اقبال کی شہرہ آفاق نظم خضر راہ پڑھاتے تو طلبہ ان کے سحر بیانی میں گم جاتے تھے۔ڈاکٹر اختر بستوی کنوارے تھے۔وہ اپنے آس پاس ایک ایسی جادوئی دیوار کھڑی رکھتے تھے کہ ان کی شخصیت اور ان کے رہن سہن تک پہنچنا بہت دشوار تھا۔وہ ایک بہت بڑے داستان گو تھے۔وہ خبروں کو داستانی انداز میں پیش کرتے تھے۔وہ اکثر اپنی داستانی فضا میں جنوں، پریوں اور مافوق الفطرت عناصر کو بھی شامل کرتے تھے۔ان کی شخصیت کی آہنی دیوار کو آج کی زبان میں متعارف کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے آس پاس ایک مضبوط جیمر لگا ہوا تھا جسے عبور کر پانا ہر آدمی کے لئے ناممکن تھا۔

محمود الٰہی صاحب نہ صرف اساتذہ بلکہ اپنے اسٹوڈنٹس کی بھی خیر خبر لیتے رہتے تھے۔اس کے لئے وہ اپنے طالب علموں ہی سے سب کے متعلق دریافت کرتے رہتے تھے۔وہ یونیورسٹی کی خبروں کو بھی اسٹوڈنٹس سے شیئر کرتے تھے۔وہ یونی ورسیٹی میں ضروری خبروں کو ایسے بتایا کرتے تھے جیسے ان کو معلوم نہ ہو۔وہ سیاسی خبروں کو بھی شیئر کرتے تھے۔وہ کانگریس کے حامی تھے اور طلبہ سے رجحانات کا پتہ لگانے کی کوشش بھی کرتے رہتے تھے۔مجھے یاد ہے جب 1989 میں جنتا دل کا سیاسی بخار اپنے عروج پر تھا۔میں استاد کا ذہن نہیں بھانپ پایا اور وی پی سنگھ کے حق میں زور شور سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔میری احمقانہ گفتگو سن کر استاد خاموش ہو گئے۔آج بھی ان کی خاموشی مجھے کھل جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کاش میں نے اتنا سختی سے اپنا رد عمل ظاہر نہیں کیا ہوتا۔

پروفیسر محمود الٰہی صاحب کانگریس کے دوران اقتدار کئی بار یوپی اردو اکادمی کے چیئر مین کے عہدے پر فائز رہے۔اس دوران انہوں نے ناقابل فراموش کام انجام دئے۔وہ اکادمی کا سارا اشاعتی کام اپنی نگرانی میں کراتے تھے۔گورکھپور میں ڈاکٹر شعیب احمد ان کے پسندیدہ کاتب تھے۔انہوں نے شعیب سے سیکڑوں کتابوں کی کتابت کرائی۔شعیب کی کتابت کے تعلق سے کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ایک مرتبہ اردو اکادمی میں کوئی سیمینار تھا جس کے لئے پوسٹر کی کتابت بھی شعیب صاحب نے کی تھی۔اس واقعے کو استاد محترم خود مسکرا کر سنایا کرتے تھے۔کیسے شعیب نے اکادمی کی صدر حامدہ حبیب اللہ کو حاملہ حبیب اللہ کر دیا تھا۔استاد نے پورا پوسٹر دوبارہ چھپوایا تھا۔یہ فاش غلطی تھی۔مگر کاتب کی تو سو غلطی معاف۔اس کے باوجود استاد نے شعیب کو کچھ نہیں کہا بلکہ اکادمی میں ان کے پینڈنگ بلس کو فوراً پاس کرایا۔استاد کو خیال آیا کہ کہیں بل کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے تو یہ فاش غلطی نہیں ہوئی تھی۔خدا جانے۔جب وہ الہلال اور البلاغ کی تدوین کر رہے تھے۔لکھنؤ اور گورکھپور ایک نقطے پر منجمد ہو گیا تھا۔ابھی لکھنؤ اور ابھی گورکھپور۔شام کو معلوم ہوا کہ استاد گھر پر ہیں صبح معلوم ہوا کہ لکھنؤ گئے۔اس کے علاوہ استاد محترم پٹنہ رام پور دہلی ہی نہیں بلکہ پاکستان تک کے کتب خانوں سے متواتر رابطے میں تھے۔جہاں کہیں بھی الہلال کی فائلوں کے حاصل ہونے کا امکان ہوتا استاد وہاں رابطہ کرتے تھے۔اس کام میں استاد نے ریسرچ اسکالرز کے ذمہ بھی بہت سارا کام لگا رکھا تھا۔وہ ریسرچ اسکالرز کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لے رہے تھے۔پروف ریڈنگ کا کام تو خاص طور سے ریسرچ اسکالرز کر رہے تھے۔انہوں نے ہر کام کے لئے ریسرچ اسکالرز کو پے مینٹ کیا۔پروف ریڈنگ کے لئے فی صفحہ 50 پیسے دیتے تھے۔اس رقم سے ریسرچ اسکالرز کی اچھی خاصی مدد ہو جاتی تھی۔جب وہ الہلال پر کام کر رہے تھے۔4 پروفیسر کالونی اکادمی کے دوسرے دفتر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ان کے گھر میں ڈرائنگ روم سے لیکر بیڈ روم تک چاروں طرف الہلال کی فائلوں کا انبار لگا رہتا تھا۔الہلال کی تدوین ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔اس کام کو وہ عبادت سمجھ کر کر رہے تھے۔یہ ایک لیجنڈ کا ایک دوسرے لیجنڈ کے لئے سلامی جیسا عمل تھا۔ایک ادیب اور محقق کا مولانا آزاد کے لئے اس سے بڑا اخراج عقیدت نہیں ہو سکتا۔

❑❑❑

پروفیسر محمود الٰہی اور چند سنہری یادیں

ڈاکٹر امین احسن

محلہ قاضی پورہ
ٹانڈہ، امبیڈکر نگر
رابطہ: 9839745971

درجۂ حرات نقطۂ انجماد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ رات گھنے کہرے کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ سرد ہوائیں جسم میں لرزش و کپکپی پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن منتظمین کے حوصلے اور سامعین کے جوش کا عجیب عالم تھا۔ پنڈال وقت سے پہلے ہی پُر ہو چکا تھا۔

یہ بات ۹؍جنوری ۱۹۸۳ء کی ہے۔ موقع تھا ہمارے شہر ٹانڈہ میں واقع محلہ ممتاز گنج (موسہاں میدان) میں ایک ادبی تقریب اور آل انڈیا مشاعرے کا۔ جس کا اہتمام ''قومی لائبریری'' کے فعال و سرگرم تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ٹیم نے کیا تھا۔

مقصد تھا علم و ادب کو فروغ دینا۔ خصوصاً نئی نسل کو علم کی روشنی سے روشناس کرانا، حوصلہ بڑھانا اور ادب نواز حلقے کو ذہنی خوراک مہیا کرانا۔ عام طور پر مشاعرے ہماری لسانی، ادبی اور تہذیبی شناخت کے مظہر ہوا کرتے ہیں مگر یہ مشاعرہ عظیم مجاہد آزادی ''شہید اشفاق اللہ خاں'' کی شخصیت سے منسوب تھا۔ جن کے مجاہدانہ اوصاف، جذبۂ حب الوطنی و قربانی کے اعتراف میں ان کے نام سے ''شہید اشفاق اللہ خاں ایوارڈ''، تعلیمی سیشن ۸۲-۱۹۸۱ء میں مڈل، ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے سالانہ امتحانات میں شہر و اطراف ٹانڈہ کے مختلف تعلیمی اداروں و درسگاہوں میں زیر تعلیم ان طلبہ کو توصیفی سند و تمغے اور انعامات سے نوازا جانا تھا جنہوں نے مجموعی طور پر ان درجات میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔

راقم الحروف نے بھی مڈل بورڈ کے امتحان میں بلاک میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس وقت تک ہمارا شعور اتنا پختہ نہیں تھا کہ ہم اس تقریب کے اغراض و مقاصد کو کلی طور پر سمجھ سکتے۔ بس دماغ میں اتنی سی بات تھی کہ ہمیں چاندی کا میڈل اور انعام ملنے والا ہے۔

کون مہمانِ خصوصی ہے؟ کون صاحب تقریب کے صدر ہیں؟ کس کے بدست انعامات تقسیم کئے جائیں گے؟ ان سب سوالات کا جواب تھا تو صرف اتنا کہ کوئی علم دوست اور بزرگ شخصیت۔ جیسا کہ عموماً تعلیمی اداروں میں اور جلسوں میں مختلف تقریبات کے موقع پر ہوتا ہے۔

ہم اپنے اسکول کے پرنسپل جناب رام آسرے ورما اور انگریزی کے استاد جناب محمد اسلم کے ہمراہ وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں پہنچ کر معینہ نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ تقریب دو حصوں میں انجام پذیر ہوئی تھی۔ ضابطے کے مطابق پہلے حصہ میں ''تعلیم کی اہمیت و افادیت'' کے موضوع پر ڈاکٹر اختر بستوی (لیکچرر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی) نے مقالہ پڑھا اور اس کے بعد مہمانِ خصوصی پروفیسر محمود الٰہی صاحب (صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی و چیئرمین اردو اکادمی اتر پردیش) نے مذکورہ موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

اس کے بعد وہ گھڑی آن پہنچی جس کا ہمیں بے صبری سے انتظار تھا یعنی انعامات و توصیفی اسناد کی تقسیم۔ جیسے ہی ہمارا نام پکارا گیا۔ ہم والہانہ جوش و حوصلے کے ساتھ اسٹیج پر پہنچے اور صاحب تقسیم ایوارڈ کے بدست تالیوں کی گونج کے درمیان میڈل و توصیفی سند اور نقدی لفافہ حاصل کیا۔ اسی طرح دیگر طلباء کو بھی یکے بعد دیگرے توصیفی اسناد، میڈل وغیرہ سے سرفراز کیا گیا۔ محمود الٰہی صاحب سے یہ ہماری پہلی غیر شعوری ملاقات تھی۔ غیر شعوری اس لئے کہ اس وقت تک اردو ادب سے ہمارا رشتہ بہت مضبوط نہیں تھا۔

ایک عرصہ بیت گیا۔ ہمارا تعلیمی سفر جاری و ساری رہا۔ گریجویشن میں ہمارے منتخب مضامین تاریخ، انگریزی اور اردو ادب تھے۔ اسی زمانے میں کالج کی لائبریری میں موجود اردو کی نصابی کتب میں پہلی بار محمود الٰہی صاحب کا نام نظر نواز ہوا۔ دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کون شخصیت ہیں؟ ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ اور اسی طرح کے دیگر کئی سوالات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ جب بزرگوں اور ادب شناس لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ یہ ہمارے ہی دیار محلہ چھجہ پور کے باشندے ہیں اور اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اردو اکاڈمی اتر پردیش کے چیئرمین کے عہدے پر بھی فائز ہیں۔ یہ مرتبہ انھیں ان کے علمی و ادبی اور تحقیقی کارناموں کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ اس درمیان ہم اکثر ان کے مضامین، اداریے وغیرہ سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ ایک غائبانہ تعارف ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ لیکن باقاعدہ روبرو ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ ہمیں اس وقت تک سرکاری پرائمری اسکول میں ملازمت مل چکی تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہم نے اپنے تعلیمی سفر کو مزید آگے بڑھانے اور مستقبل میں کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں علمی خدمات انجام دینے کے لئے ۱۹۹۸ء میں ایم اے اردو اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ اسی درمیان نیٹ (NET) کی تیاری کے سلسلے میں ان سے ملاقات کا سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو پھر دائمی شکل اختیار کر گیا اور آخری وقت تک جاری رہا۔

آج بھی مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ہم اپنے دوست اختر عالم کے ہمراہ پہلی بار ان کے دولت کدہ پر ملاقات کرنے گئے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ انھوں نے دروازہ کھولا اور ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر رسمی تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے انھوں نے ہمارے تدریسی فرائض و طلب علم کے علاوہ دیگر

ایک عرصہ بیت گیا۔ ہمارا تعلیمی سفر جاری وساری رہا۔ گریجویشن میں ہمارے منتخب مضامین تاریخ، انگریزی اور اردو ادب تھے۔ اسی زمانے میں کالج کی لائبریری میں موجود اردو کی نصابی کتب میں پہلی بار محمود الٰہی صاحب کا نام نظر نواز ہوا۔ دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کون شخصیت ہیں؟ ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ اور اسی طرح کے دیگر کئی سوالات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ جب بزرگوں اور ادب شناس لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ یہ ہمارے ہی دیار محلہ چھجہ پور کے باشندے ہیں اور اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اردو اکاڈمی اتر پردیش کے چیئرمین کے عہدے پر بھی فائز ہیں۔ یہ مرتبہ انھیں ان کے علمی و ادبی اور تحقیقی کارناموں کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ اس درمیان ہم اکثر ان کے مضامین، اداریے وغیرہ سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ ایک غائبانہ تعارف ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ لیکن باقاعدہ روبرو ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ ہمیں اس وقت تک سرکاری پرائمری اسکول میں ملازمت مل چکی تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہم نے اپنے تعلیمی سفر کو مزید آگے بڑھانے اور مستقبل میں کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں علمی خدمات انجام دینے کے لئے ۱۹۹۸ء میں ایم اے اردو اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔

مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا۔ کسی حد تک شعر وشاعری سے شغف اور دلچسپی کی بات سن کر خوشی کا اظہار کیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں انھوں نے ہمیں اس شوق سے باز رہنے کی تلقین کی۔ مزید مطالعے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ نثر لکھنے کی ترغیب وصلاح دی۔

ان کی مہمان نوازی کا طریقہ بھی بالکل جدا ہوتا تھا۔ عام طور پر گھریلو خادمہ اور کبھی کبھی ان کی اہلیہ محترمہ گرم پانی کی کیتلی اور ٹرے میں گرین ٹی کا ڈبہ وغیرہ میز پر رکھ کر چلی جاتی تھیں۔ پھر وہ خود اپنے ہاتھوں سے چائے بناتے اور مہمانوں کی پسند وضرورت کے لحاظ سے شکر وغیرہ کی آمیزش کرتے تھے۔ طشتری میں بسکٹ اور نمکین وغیرہ سلیقے سے پیش کرتے تھے۔ اس درمیان سلسلۂ جنبانی دراز ہوتا چلا جاتا تھا۔ گفتگو کا موضوع کبھی خالص ادبی ہوتا تو کبھی علمی، کبھی عصری حالات ہوتے تھے تو کبھی سماجی وسیاسی مسائل، کبھی ملّی و مذہبی معاملات ہوتے تو کبھی ملک وقوم کی ذہنی پستی وغلامی سے نجات کا راستہ وتدارک، کبھی تعلیمی درسگاہوں کی انحطاط پذیری کا مرثیہ ہوتا تھا تو کبھی ان کی روبہ زوالی کے ازالے کی تدابیر، کبھی روایتی ادبی روش کے قصے کے ہوتے تو کبھی اردو کے گراں قدر شہ پاروں کا تذکرہ، کبھی اردو کی موجودہ صورت حال ہوتی تو کبھی اس کے مستقبل کے اندیشے، کبھی ادبی فن پاروں کے اہم نکتے ہوتے تو کبھی خاص ادبی رجحانات وتحریکوں کے مثبت ومنفی پہلوؤں اور عصری معنویت کی نشاندہی۔ غرض یہ کہ ہر ملاقات معلومات کا بیش بہا خزانہ ہوتی تھی اور اس امر کی وضاحت کرتی تھی کہ کسی لائبریری میں بیس گھنٹہ کا مطالعہ، ایک علم دوست شخصیت سے ایک گھنٹہ گفتگو کرنے کے برابر ہوتا ہے۔

ان کی ذہانت، قوت حافظہ، و یادداشت اس قدر تیز تھی کہ ادھر آپ کی زبان سے سوال نکلا ادھر جواب حاضر۔ نیٹ (NET) امتحان کی تیاری کے دوران اکثر پیچیدہ اور مشکل سوالات لے کر جب ان کے پاس جاتا تو آن کی آن میں تشفی بخش اور صحیح جواب مل جاتے تھے اور ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بچ جاتے تھے۔ یہ ان کی صحبتوں اور ملاقاتوں ہی کا فیضان تھا کہ ہم نے دسمبر ۱۹۹۹ء میں پہلی ہی کوشش میں مذکورہ امتحان میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

وہ طلباء کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور ہمہ جہت ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ نشانِ منزل تک پہنچنے میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لئے فکرمندی ان کے شعار کا حصہ تھی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے باوجود شوقِ مطالعہ اور ادبی وفکری خیالات کو قلم بند کرنا ان کے روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا۔ ضابطے اور اصولوں کی پابندی بڑی سختی اور ایمانداری سے کرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں سے ملاقات کا ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔ عام طور پر سہ پہر کو ۳/ بجے سے شام ۶/ بجے کے درمیان ملاقات کرتے تھے لیکن حسب ضرورت صبح ۸/ بجے بھی ملاقات ہوسکتی تھی۔

۴/ جنوری ۲۰۰۱ء میں جب ہم نے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے موضوع کے انتخاب اور سناپسس کی تیاری میں ہر ممکن مدد کی۔ یہی نہیں بلکہ نگراں (ریسرچ گائیڈ) کے لئے بھی انھوں نے ڈاکٹر سید عبدالباری کا نام تجویز کیا جو ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنے آبائی مکان محلہ الہداد پور ٹانڈہ میں قیام پذیر ہوچکے تھے۔ ہم نے ان سے ملاقات کی۔ تعارف کے بعد انھوں نے ہامی بھری۔ ہمیں اطمینان ہوا۔ دوسرے دن ایک بار پھر ہم محمود الٰہی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ آپ اپنی

ان کی مہمان نوازی کا طریقہ بھی بالکل جدا ہوتا تھا۔ عام طور پر گھریلو خادمہ اور کبھی کبھی ان کی اہلیہ محترمہ گرم پانی کی کیتلی اور ٹرے میں گرین ٹی کا ڈبہ وغیرہ میز پر رکھ کر چلی جاتی تھیں۔ پھر وہ خود اپنے ہاتھوں سے چائے بناتے اور مہمانوں کی پسند وضرورت کے لحاظ سے شکر وغیرہ کی آمیزش کرتے تھے۔ طشتری میں بسکٹ اور نمکین وغیرہ سلیقے سے پیش کرتے تھے۔

اس درمیان سلسلۂ جنبانی دراز ہوتا چلا جاتا تھا۔ گفتگو کا موضوع کبھی خالص ادبی ہوتا تو کبھی علمی، کبھی عصری حالات ہوتے تھے تو کبھی سماجی وسیاسی مسائل، کبھی ملّی و مذہبی معاملات ہوتے تو کبھی ملک وقوم کی ذہنی پستی وغلامی سے نجات کا راستہ وتدارک، کبھی تعلیمی درسگاہوں کی انحطاط پذیری کا مرثیہ ہوتا تھا تو کبھی ان کی روبہ زوالی کے ازالے کی تدابیر، کبھی روایتی ادبی روش کے قصے کے ہوتے تو کبھی اردو کے گراں قدر شہ پاروں کا تذکرہ، کبھی اردو کی موجودہ صورت حال ہوتی تو کبھی اس کے مستقبل کے اندیشے، کبھی ادبی فن پاروں کے اہم نکتے ہوتے تو کبھی خاص ادبی رجحانات و تحریکوں کے مثبت ومنفی پہلوؤں اور عصری معنویت کی نشاندہی۔

ریسرچ کے موضوع پر کم از کم دو صفحہ کا مضمون لکھ کر لائیے کہ آپ نے کیوں کر اس موضوع (پریم چند کے سماجی نظریات ۔ناولوں کی روشنی میں) کا انتخاب کیا؟ ہم نے رات میں مضمون لکھ ڈالا۔دوسرے دن صبح ۸؍بجے مضمون کے ساتھ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انھوں نے مضمون دیکھا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا’’جناب آپ ریسرچ کر سکتے ہیں۔‘‘ ان کا یہ جملہ ہمارے حوصلوں کو اڑان بخشنے میں مددگار ثابت ہوا۔۸؍اگست ۲۰۰۱ءکو ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی فیض آباد میں مذکورہ موضوع پر ریسرچ کیلئے ہمارا رجسٹریشن ہوگیا۔ریسرچ کے دوران قدم قدم پر ان کی مدد،مشورے اور رہنمائی نے ہمارا کام کافی حد تک آسان کر دیا۔

ان کی شخصیت، بلند اخلاق،اعلیٰ ظرفی اور حسن عمل کا مرقع تھی۔ادب نوازی ان کا شیوہ تھا۔وہ ادباء وشعراء اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔لیکن ادبی محفلوں میں کسی قدر محتاط انداز میں شرکت کرتے تھے۔

شہر میں منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں کبھی کبھی تشریف لے جاتے تھے۔اس کے برعکس وہ سیمینار و سمپوزیم اور ادبی مذاکروں میں ترجیحی بنیاد پر حصہ لیتے تھے۔

۱۶؍اگست ۲۰۰۴ءکی بات انس مسرور انصاری کے شعری مجموعہ’’فجر کا الاؤ‘‘ کی رسم اجرا کی تقریب محمود الٰہی صاحب کے بدست انجام پذیر ہوناتھی۔

وہ وقت مقررہ پر بذریعہ رکشہ’’مسلم نسواں انٹر کالج‘‘ کے صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔رکشہ رکا وہ نیچے اترے اور بیگ سے کرایہ ادا کرنے کے لئے روپئے نکالنے لگے۔

ہم لوگوں نے ہرچند کوشش کی کہ کرایہ ہم ادا کر دیتے ہیں لیکن انھوں نے ہمیں ایسا

ان کی شخصیت، بلند اخلاق،اعلیٰ ظرفی اور حسن عمل کا مرقع تھی۔ادب نوازی ان کا شیوہ تھا۔وہ ادباء وشعراء اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔لیکن ادبی محفلوں میں کسی قدر محتاط انداز میں شرکت کرتے تھے۔

شہر میں منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں کبھی کبھی تشریف لے جاتے تھے۔اس کے برعکس وہ سیمینار و سمپوزیم اور ادبی مذاکروں میں ترجیحی بنیاد پر حصہ لیتے تھے۔

۱۶؍ اگست ۲۰۰۴ء کی بات انس مسرور انصاری کے شعری مجموعہ’’فجر کا الاؤ‘‘ کی رسم اجرا کی تقریب محمود الٰہی صاحب کے بدست انجام پذیر ہوناتھی۔

وہ وقت مقررہ پر بذریعہ رکشہ’’مسلم نسواں انٹر کالج‘‘ کے صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔رکشہ رکا وہ نیچے اترے اور بیگ سے کرایہ ادا کرنے کے لئے روپئے نکالنے لگے۔

ہم لوگوں نے ہرچند کوشش کی کہ کرایہ ہم ادا کرے دیتے ہیں لیکن انھوں نے ہمیں ایسا کرنے سے باز رکھا اور خود ہی کرایہ ادا کیا۔یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔

کرنے سے باز رکھا اور خود ہی کرایہ ادا کیا۔یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔

کہا جاتا ہے کہ’’بابائے اردو‘‘ مولوی عبدالحق نے اردو کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا تھا اور تمام عمر اردو کی خدمت میں جی جان سے لگے رہے۔محمود الٰہی صاحب نے بھی کم وبیش انھیں کی روش اختیار کی تھی۔وہ بھی اردو کی بقاء وتحفظ اور فروغ کے لئے ہمہ تن مصروف اور مشغول رہتے تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں انھوں نے اپنے ڈرائنگ روم میں رکھے دو بریف کیس کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی اور فرمایا:

’جناب آپ جانتے ہیں ان میں کیا ہے؟‘

ظاہر ہے ہمارا جواب نفی میں تھا تو انھوں نے بتانا شروع کیا کہ اس میں برٹش انڈیا لائبریری میں موجود ان کتابوں اور ادبی فن پاروں وغیرہ کی فلم (NEGATIVE) ہیں۔جو اس وقت ہندوستان میں یا تو کم یاب ہیں یا نایاب۔ہمارا تجسس بڑھتا گیا اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔انھوں نے ایک دو فلم کھول کر دکھائی بھی۔جسے ننگی آنکھوں سے بمشکل پڑھا جاسکتا تھا۔اس کے لئے پروجیکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ان میں اردو کے وہ بیش قیمت مخطوطات اور قلمی نسخے بھی تھے۔جسے انگریزوں نے ہندوستان سے لے جاکر برٹش انڈیا لائبریری (لندن) میں محفوظ کر رکھا تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں بے ساختہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غریب الوطنی میں بھی اردو کی محبت کا دامن نہیں چھوڑا۔وہ اردو کی محبت سے اس قدر سرشار رہتے تھے کہ ان کا تحقیقی دماغ اردو کی بقا و بہتری اور تحفظ کے لئے شب و روز کاوشیں کرتا رہتا تھا۔

□□□

باب پنجم

منظومات

صبح نو

انقلابی گیت گانے کا زمانہ آگیا!
دہر میں ہلچل مچانے کا زمانہ آگیا!

اپنی حد سے بڑھ گئے ''انسان'' کے ظلم وستم
خود کو اب باغی بنانے کا زمانہ آگیا!

تابکے باطل سے ڈرنا، تاکجا رنگ جمود؟
اب پیام حق سنانے کا زمانہ آگیا!

مرحبا صد مرحبا اے عندلیبان چمن!
اب تمہارے چہچہانے کا زمانہ آگیا

نغمۂ و مینا و مے سے تابکے کھیلا کریں؟
تیغ و خنجر کے اٹھانے کا زمانہ آگیا

دیکھ زخمیؔ ہر طرف اک شورِ دارو گیر ہے!
پھر ترے میدان میں آنے کا زمانہ آگیا

صبح آزادی

مرحبا اے ہند تیری تیرہ بختی جائے ہے
صبح آزادی تجھے اپنی جھلک دکھلائے ہے

اس طرح میں گا رہا ہوں نغمہ ہائے انقلاب
آسماں ہے رقص میں تاروں کو وجد آجائے ہے

میں ابھی چاہوں بدل ڈالوں نظامِ کائنات
میری رگ رگ میں کچھ ایسا خون پایا جائے ہے

پی کے کچھ بیگانۂ عالم ہوا جاتا ہے دِل
میکدہ میں آج جانے کیا پلایا جائے ہے

میری آہوں سے دو عالم لرزہ براندام ہے
میرے نالوں سے زمیں کیا آسماں تھرّائے ہے

ہاں وہی زخمیؔ وہی اک شاعرِ آوارہ گرد
حُرّیت کے زمزموں سے اپنا جی بہلائے ہے

میرا عزم

ابھی رہنے دے اپنے میکدے میں جام اے ساقی
ابھی ساز بغاوت پر مجھے کچھ گیت گانا ہے
وطن کے ذرّے ذرّے کو ابھی باغی بنانا ہے

مٹانا ہے ابھی نام و نشاں ظالم حکومت کا
مجھے پیغام دینا ہے ابھی گھر گھر اخوّت کا

'غلامی' کے جو حامی ہیں انہیں پیروں سے ملنا ہے
جو کانٹے راہِ آزادی میں ہیں ان کو کچلنا ہے
ابھی تو خون مغرب سے مجھے سیراب ہونا ہے

ابھی لینا ہے مجھ کو خون بہا جھانسی کی رانی کا
شہید حُریت سلطان ٹیپو کی جوانی کا

ابھی تو خون سے بھی کھیلنی ہیں ہولیاں مجھ کو
اسی سینہ پہ کھانی ہیں عدو کی گولیاں مجھ کو

ابھی صیاد سے لینا ہے لڑ کر گلستاں اپنا
ابھی آزاد کرنا ہے مجھے ہندوستاں اپنا

ابھی مت لے خدارا جام و مے کا نام اے ساقی

مجاہد

قصرِ شاہی پھونک دو پیغام ہے میرے لئے
آج تو بس اِذن قتل عام ہے میرے لئے

جنگِ آزادی 'بغاوت' کست وخون وانقلاب
لمحہ بر لمحہ نیا ہنگام ہے میرے لئے

راہ آزادی میں مرنا ہے حیات دائمی
زندگی کا موت بھی پیغام ہے میرے لئے

میں مجاہد ہوں مجھے بستر پہ نیند آتی نہیں
تیغ ہی کی چھاؤں میں آرام ہے میرے لئے

میں فدائے ساغر صہبائے لالہ گوں نہیں
خون دشمن کا چھلکتا جام ہے میرے لئے

میں نیاز وناز کے جھگڑے سے کوسوں دور ہوں
دردِ الفت شرم کا پیغام ہے میرے لئے

اپنے نغموں سے ہلا سکتا ہوں ساری کائنات
یہ بھی زخمی کوئی مشکل کام ہے میرے لئے

گاندھی جی

جنوری کی تیسویں تاریخ تھی اور وقت شام
چل رہا تھا جیسے چلتا ہے زمانے کا نظام

ساری دنیا محو کاروبار آتی تھی نظر
گا رہا تھا اپنی اپنی دھن میں ہر فرد بشر

تھام لی گاندھی نے بھی ایسے میں اپنی راہ کو
چل پڑا برلا بھون سے وہ عبادت گاہ کو

تاب چلنے کی نہ تھی پھر بھی بچارا چل پڑا
لے کر پوتی اور بہو کا وہ سہارا چل پڑا

جیسے پہنچا ایک ہندو نوجواں آگے بڑھا
بڑھ کے اس کے دو ہی گز کے فاصلے پر آگیا

جو نہ کرنا چاہیئے تھا اس نے وہ بھی کر دیا
گولیوں سے سینہ باپو کو چھلنی کر دیا

شیطنیت غش کھا گئی فرعونیت تھرّا گئی
ہر خباثت الاماں و الامیں چلا اٹھی

متفرق اشعار

جنگ کی کالی گھٹاؤں کو کفن پہنا دو
زہر آلود فضاؤں کو کفن پہنا دو
اٹھو مزدورو اور اے امن کے پیغامبرو!
عصر حاضر کے خداؤں کو کفن پہنا دو

....

جنوں پہ رنگ چڑھا شیطنت پہ رعنائی
نظام دہر نے چپکے سے لی جو انگڑائی

....

جو کر دے خاک کے پردے کو ہمسر شبلی
وہ ایک عطیۂ پیاں شکن کہاں سے ملے

....

وفا پرستوں کے آنسو اور ان کے خوں کے سوا
بتا کچھ اور ہے ساقی شراب خانے میں

....

بہار آئی ہے غنچو ہنسو، پھلو، پھولو
ابھی ہے دیر مگر میرے مسکرانے میں

....

باب ششم

متفرقات

پروفیسر محمود الٰہی کی تخلیقات

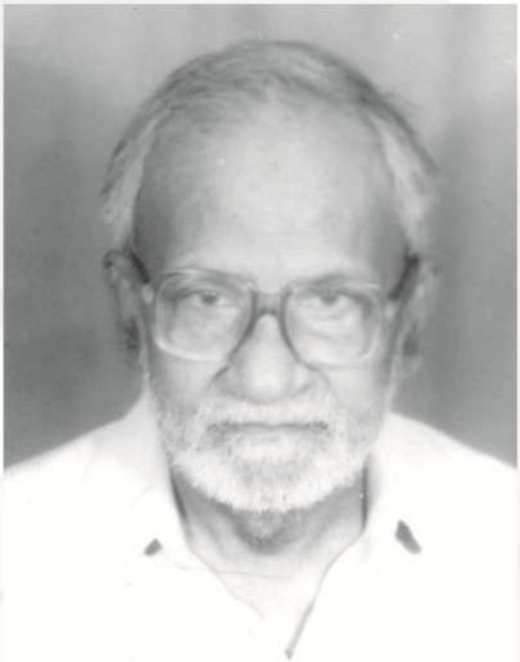

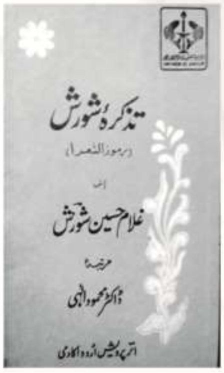

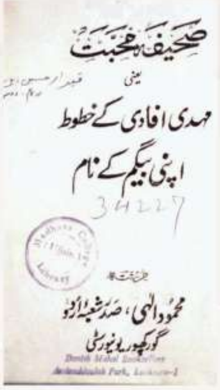

پروفیسر محمود الٰہی کی خطوط نگاری

ڈاکٹر سلیم احمد

C-544/168

الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ

رابطہ: 9415693119

خط نگاری کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بھی مورخ ہیں سب کی الگ الگ رائے ہے چاہے عبداللہ یوسف علی ہوں یا سید منظر حسن برنی یا پھر خورشید الاسلام اور یا پھر بیگم نیلوفر احمد تمام مورخین کے دلائل کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر مختصراً قرآن کریم کے سورہ نمل کا مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے سبا کی ملکہ بلقیس کو جو پیغام ہدہد پرندے کے ذریعہ بھیجا تھا وہ بھی ایک خط تھا جس کا ذکر قرآن کریم کی تفسیر میں اس طرح ہے کہ ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مکتوب لکھا'' جبکہ ملکہ بلقیس کا یہ کہنا کہ ''اے میرے لشکر کے بزرگو! میرے پاس ایک بہت ذی عزت خط بھیجا گیا'' یہ وہ جملے ہیں جس کی بنا پر یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے عہد میں مکتوب نگاری رائج تھی یا انہوں نے رائج کیا۔ جبکہ اس سے قبل کہیں مکتوب نگاری کی روایت یا خطوط نگاری کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ لہذا سلیمان علیہ السلام کے اس خط کو باقاعدہ طور پر پہلا تحریر کردہ خط کہا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں بیگم نیلوفر احمد بھی سلیمان علیہ السلام کے اس خط کو پہلا خط تسلیم کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''...........غالباً سب سے پہلا خط عبرانی زبان میں تحریر کیا جو ملکہ سبا کے نام ارسال کیا گیا تھا وہ مختصر اور بامعنی اور تبلیغ تھا جس کی بدولت ملکہ سبا (بلقیس) مشرف بااسلام ہوئی تھیں''

(اردو خط نگاری کی روایت اور غالب- بیگم نیلوفر احمد صفحہ 30)

بہر حال ہمارا مقصد یہاں پر خطوط نگاری کی تعریف پر بحث کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد تو محمود الٰہی صاحب کی خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالنا ہے۔

محمود الٰہی صاحب کے خطوط میں جہاں وقت اور حالات کا ذکر ملتا ہے وہیں تحقیقی گہرائی اور علمی گیرائی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عبدالرحیم صاحب گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے تنگی کی حالت میں جب ان کے والد نے انہیں کپڑا بننے کے کام میں لگانا چاہا تو وہ گھر سے نکل گئے اور علم کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے کلکتہ میں سکونت اختیار کی۔ عبدالرحیم جن کا

تخلص ''تمنا'' تھا تاریخ علم و ادب کی ایک عدیم المثال علمی و ادبی و مذہبی شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی کے حوالے سے ''دبستان گورکھپور'' میں مسلم انصاری صاحب لکھتے ہیں:

'' بقول محمود الٰہی مولوی عبدالرحیم نے مختلف موضوعات پر مختلف زبانوں میں بیسیوں کتابیں لکھی تھیں مگر اب ان میں سے ایک بھی نظر نہیں آتی۔ ان کا تفصیلی تذکرہ بھی کہیں نہیں ملتا۔''

(دبستان گورکھپور، مسلم انصاری ص ۵۱)

غالباً عابد رضا بیدار صاحب عبدالرحیم گورکھپوری پر کوئی کام کر رہے تھے۔ شاید اسی سلسلے میں محمود الٰہی صاحب سے کچھ معلومات مطلوب ہوں گی جس کے تحت محمود الٰہی صاحب نے یکم اگست ۱۹۹۴ کے خط میں عابد رضا بیدار کو لکھا:

'' عبدالرحیم گورکھپوری کی '' دستور زبان اردو'' کے بارے میں گرامی نامہ ملا۔ مر حوم کی کوئی کتاب مطبوعہ / مخطوطہ) یہاں نہیں ہے۔ ان کی فارسی میں ایک ناقص الاول کتاب یہاں تھی اور وہ واحد لائبریری میں محفوظ تھی لیکن میری معلومات کے مطابق واحد صاحب نے اپنی زندگی میں اسے فروخت کر دیا تھا اور اب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہوگی۔ یہ کتاب فلسفہ پر تھی۔ لیکن شروع کے چند اوراق انہوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے تھے۔'

....

'مدت ہوئی ڈھاکہ یونیورسٹی میں ان پر کوئی تحقیقی کام ہو رہا تھا۔ وہاں بھی غالباً ان کی کسی کتاب کا مخطوطہ تھا۔'

....

''ان کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کیا تھا۔ آپ ملیح آبادی کی کتاب ملاحظہ کریں تو آپ کو اس میں مولانا آزاد کی زبانی عبدالرحیم (دہریہ) گورکھپوری کا ذکر ملے گا۔''

اس طرح مذکورہ خط سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ محمود الٰہی صاحب کی نظر ایسے ادیبوں پر بھی تھی جو ادب میں بے توجہی کے سبب یا تلاش و تحقیق سے محروم رہنے کی وجہ سے گمنام تھے اسی ضمن میں مہدی افادی کا بھی ایک نام ہے ۔موصوف نے مہدی افادی کے خطوط کو بیگم مہدی کے تعاون سے صحیفۂ مہدی کے نام سے شائع کیا اور اپنی تحقیقی بصیرت کی بناء پر گمنام رہنے والے مہدی افادی کو انشاء پرداز کے طور پر ادب میں پیش کیا۔ جب صحیفۂ مہدی شائع ہوئی تو اس میں شامل خطوط سے مہدی افادی کے شبلی اور ابوالکلام آزاد سے گہرے تعلقات کا انکشاف بھی ہوا۔ مہدی افادی کی اہلیہ کے انتقال کے بعد محمود الٰہی صاحب نے ۱۱ جنوری ۱۹۶۵ء کو عبدالماجد دریابادی کے ایک خط کے جواب میں جو خط لکھا اس سے مہدی افادی کا قابل احترام شخصیت عبدالماجد دریابادی کے تعلقات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس خط میں محمود الٰہی صاحب نے لکھا ہے:

'گرامی نامہ ملا آپ مجھے خطاب کریں ، یہ میرے لئے ہر حیثیت سے قابل فخر امر ہے۔'

....

''مہدی مرحوم کی وفات پر بہت لوگوں نے تعزیتی خطوط لکھے مگر آپ کے خطوط میں جو جوہر تھا وہ دوسروں کو کہاں نصیب۔ آپ نے تعزیت میں وہ الفاظ لکھے تھے جو........... کے تقاضوں کے مطابق تھا اور جو........... مرحوم کے لئے کارآمد تھے۔''

پروفیسر محمود الٰہی صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ گرمی کی پوری تعطیل وہ کتب خانوں کی گرد آلود کتابوں کے درمیان مخطوطے کی تلاش میں گزار دیتے۔ اسی تلاش و تحقیق کے سلسلہ میں وہ جونپور میں واقع خانقاہ رشیدہ کے کتب خانے میں دیوان حافظ کی تلاش میں تھے کہ انہیں تذکرہ شورش کا خطی نسخہ مل گیا۔ اس سلسلہ میں وہ تذکرہ سورش کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

'میں خانقاہ رشیدہ جونپور میں دیوان حافظ کے اس نادر نسخہ کو تلاش کر رہا تھا جس کی کتابت 824ھ میں ہوئی اور جسے پروفیسر نذیر احمد صاحب نے مرتب کر کے ایران سے شائع کرا دیا۔ دیوان حافظ کا مذکورہ نسخہ تو مجھے بعد میں ملا لیکن اس کی تلاش کے دوران تذکرہ شورش ہاتھ آ گیا۔'

(تذکرہ شورش۔ مرتبہ محمود الٰہی صفحہ 5)

بہرحال تذکرہ شورش کے سلسلہ میں بلکہ تحقیق کے تمام نکات پر وہ قاضی عبدالودود صاحب سے مشورہ ضرور کرتے۔ اسی ضمن میں 16 مارچ 1966 کو تحریر کردہ ایک خط میں وہ قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

''میں نے تذکرہ شورش کے بارے میں آپ کو کل ایک خط لکھا ہے، ملا ہوگا۔ اس تذکرہ میں شورش نے اپنے (287) اشعار نقل کئے ہیں جبکہ مطبوعہ نسخہ میں تقریباً 204 اشعار ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کلام کو الگ سے شائع کیا جا سکتا ہے۔...... میں جلد ہی آپ کے پاس اس کی خاص خاص باتیں نقل کر کے بھیجوں گا۔ اس کے بعد اصل نسخہ بھی بھیج دوں گا۔ میرا ارادہ پختہ ہوتا جا رہا

ہے کہ اسے ایڈیٹ کر دوں تعطیلات آ رہی ہیں ان میں یہ کام کر ڈالوں گا۔آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔'

تذکرہ شورش سے قبل جب وہ اپنا تحقیقی مقالہ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لکھ رہے تھے۔تب بھی وہ قاضی صاحب کے مشوروں سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔تحقیقی مقالے کو حتمی شکل دینے سے قبل 3 مئی 1957 کو اپنے ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

'میں نے علی گڑھ میں اپنے زیر ترتیب مقالے کے سلسلہ میں آپ سے استفادہ کی خواہش ظاہر کی تھی آپ نے بہت سے مشورہ دئے تھے اور فرمایا تھا کہ اپنی مشکلات کے بارے میں آپ کو وقتاً فوقتاً لکھتا رہوں۔میں نے مقالہ تقریباً مکمل کر لیا ہے۔میری دلی خواہش ہے کہ آپ کی ہدایات کی روشنی میں مجھے نظر ثانی کا موقع مل سکے اس مقصد کی تکمیل کے لیے میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔'

در اصل قاضی عبدالودود صاحب ایک بڑے اور معتبر محقق تھے بلکہ تحقیق ہی ان کا شیوہ تھا ان کے محققانہ عظمت پر بے بکانہ اعتراف

موصوف 6 اکتوبر 1962 کے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

'......میرا ایمان ہے کہ اب تک اردو زبان وادب نے آپ سے بڑا محقق نہیں پیدا کیا۔لوگ یونیورسٹیوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر جو بھی بن جائیں لیکن تحقیق کے باب میں انہیں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑے گا۔میرے محترم! آپ نے اردو والوں کو تحقیق کرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے اور اس صنف کی عزت بڑھا دی ہے۔'

موصوف قاضی صاحب کے تحقیقی بصیرت کے معترف تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ اپنے تحقیقی کام میں ان کی رہنمائی شامل حال تھی۔بلکہ انہوں نے قاضی صاحب سے تحقیق کے میدان میں بہت کچھ سیکھا بھی۔اس سلسلہ میں محمود الٰہی صاحب نے جو خطوط قاضی صاحب کو حوالہ قلم کئے وہ سارے خطوط معلوماتی اور ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔

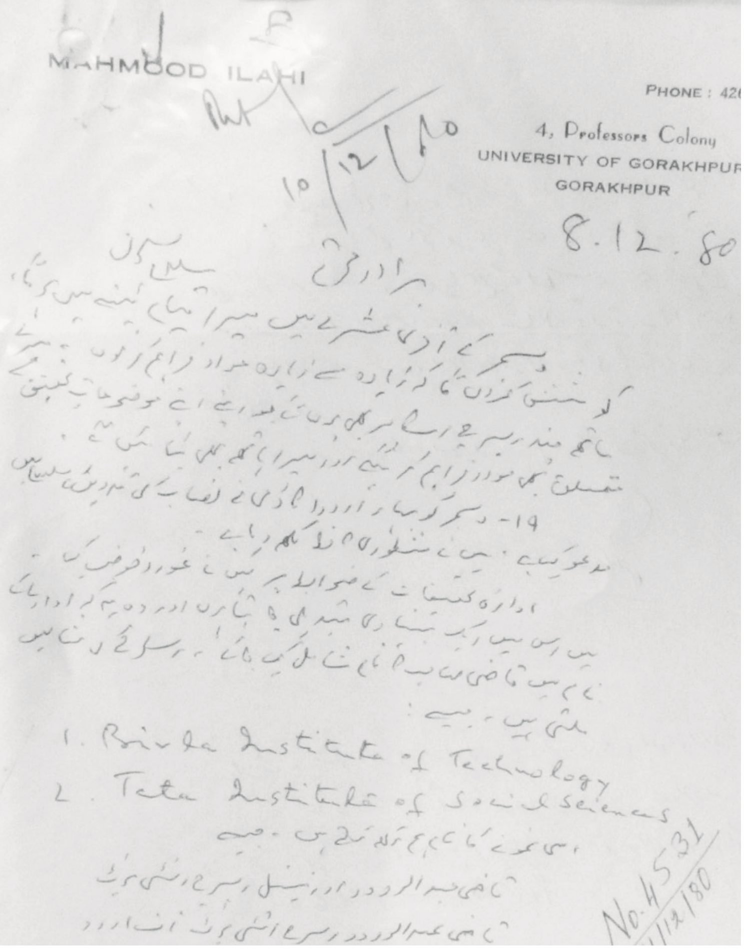

MAHMOOD ILAHI

PHONE : 42

4, Professors Colony
UNIVERSITY OF GORAKHPUR
GORAKHPUR

8.12.80

1. Birla Institute of Technology
2. Tata Institute of Social Sciences

No. 4531
11/12/80

عکس تحریر

۱۹۸۸ عیسوی میں آزاد صدی منایا جا رہا تھا۔حسن اتفاق محمود الٰہی صاحب اس وقت اتر پردیش اردو اکادمی کے چیرمین تھے یہ ایک اچھا موقع تھا استاد محترم کے لئے بھر پور ادبی کام کرنے اور کروانے کا لہذا انہوں نے اکادمی کی جانب سے آزاد صدی کے موقع پر ایک سو کتابوں کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔اس کے تحت نادر اخبارات مخطوطے ،دستاویزات کے ساتھ تحریک آزادی کے موضوع کتابیں تو شائع ہوئیں ہی اس میں سب سے بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ تھا الہلال اور البلاغ کے عکسی اشاعت کا۔اس کی اشاعت کے سلسلہ میں کچھ غلط فہمیاں پھیلائی گئیں جس کی وجہ سے الہلال کی اشاعت میں انہیں بہت سے مسائل سے دو چار ہونا پڑا اس کی ایک جھلک

۷؍جنوری ۱۹۸۸ کو ڈاکٹر خلیق انجم کو لکھے گئے اس خط میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

'الہلال کی اشاعت کا مسئلہ کتنا خطرناک مگر دلچسپ ہوگیا ہے اس کا علم آپ کو ان کاغذات سے ہو جائیگا جو اس خط کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ ان کاغذات کی بنیاد پر ایک نوٹ بھی لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھئے تو یہ نوٹ شائع کر دیجئے، غلط فہمی دور ہو جائیگی۔'

خلیق انجم صاحب کو لکھے اس خط سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الہلال کی عکسی اشاعت منظر عام پر آنے سے قبل کن کن دشوار گزار مراحل سے گزری ہوگی۔

پروفیسر الٰہی نے اپنی ساری زندگی حصول علم میں صرف کر دی ایسے لوگ جو حصول علم کے دیوانے ہوتے ہیں وہ نام و نمود سے بہت دور رہتے ہیں۔ انہیں لوگوں میں ڈاکٹر الٰہی بھی تھے۔ انہوں نے اگر کوئی عہدہ سنبھالا تو صرف ادب کی خدمت کے لئے مثلاً اردو اکادمی کے چیرمین شپ کا ان کے دور کو سنہرا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اپنے اس دور میں انہوں نے اکادمی کی جو مثالی ادبی علمی خدمات انجام دی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسی ہی توقع وہ ادب سے وابستہ لوگوں سے بھی کرتے تھے ۲۳؍اگست ۱۹۷۸ عیسوی کے ایک خط میں مسعود حسین خاں کو لکھتے ہیں:

'قومی آواز کی ایک حالیہ اشاعت سے جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری سے آپ کے مستعفی ہو جانے کا حال معلوم ہوا ہر چند آپ کی علی گڑھ واپسی کو لوگ ترقی معکوس کہیں گے مگر مجھے یک گونہ خوشی ہوئی کہ جیسے کوئی اپنا غیروں میں شامل ہو گیا ہو اور پھر سواد اعظم سے آملا ہو۔

میں اس وقت خوش ہوا تھا جب وائس چانسلری کے لئے آپ کا نام منظور کیا گیا تھا اور آج اس سے زیادہ خوش ہوں جب آپ نے یہ عہدہ چھوڑ دیا۔'

آج اردو کے نام پر، کہیں درس و تدریس کے نام پر تو کہیں بڑے بڑے سیمیناروں کے نام پر اردو والے ہی اردو کا گلا گھونٹ رہے ہیں خواہ درس و تدریس کا معاملہ ہو یا پھر اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے آراستہ کرنے کا، نئی نسل کی حوصلہ افزائی کا معاملہ ہو یا پھر اردو میں دستخط کرنا، درخواست لکھنا یا اپنے نام کی اردو میں تختی لگانے میں ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں آج اردو والے ہی اردو کی زبوں حالی کے ذمہ دار ہیں اور اپنوں کے چاک گریباں میں لگے رہتے ہیں۔

محمود الٰہی صاحب اردو والوں کی اس حرکت سے کس قدر نالاں ہیں اس کا اندازہ مسعود حسین خاں کو ۳؍اگست ۱۹۷۸ء کو ارسال کردہ خط سے لگایا جا سکتا ہے۔

'میں نے تو صرف اردو والوں کی شورہ پستی اور شر انگیزی دیکھی ہے اور وہ بھی بہت دو رسے یعنی گورکھپور میں رہتے ہوئے اب میرا یہ حال ہے کہ خدا کی قسم اگر کہیں اور روزی روٹی کا انتظام ہو جائے تو میں اردو کو اور اس کی خدمت کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دوں۔ تائب ہو کر قلعہ کوہ میں پناہ لینا زیادہ اچھا ہے بغض، کینہ، بدگوئی، غیبت، خوشامد، منافعت کون سی خوبی ہے جو اردو والوں میں نہیں ہے۔'

محولہ بالا خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاسدوں کا، ہاجیوں اور شاکیوں کی نازیبا حرکت سے آپ کے پایہ استقلال میں لغزش آگئی تھی لیکن محترم نے صبر ایوبی سے کام لیا تو مشیت ایزدی سے فائز المرام ہوئے۔ وی سی کے اعلیٰ عہدے پر زینت افزا ہوئے۔ اس عہدے پر وہ فائز تو ضرور ہو گئے مگر جلد سے جلد اس سے نجات پانے کی کوشش میں بھی تھے لہٰذا ۲۴؍اگست ۱۹۹۰ء کو پروفیسر اصغر عباس صاحب کو ارسال کردہ مکتوب میں لکھتے ہیں:

'اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ اعزاز بھی بخشا میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ وی سی ہو جاؤں لیکن قسمت کی بات کو کون ٹال سکتا ہے۔

میں نے مختصر مدت کے لیے یہ عہد سنبھالا تھا اور برابر میں اس کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر کا کوئی آدمی عارضی طور پر یہاں آنے کے لیے تیار ہو جائے اب ایک صاحب تیار ہو گئے جلد ہی آنے کی توقع ہے اور مجھے فرصت مل جائیگی۔'

غالباً ۶۲-۱۹۶۱ء میں علامہ اقبال کی رباعی پر مجنوں گورکھپوری اور اسلوب احمد انصاری میں بحث کا سلسلہ شروع ہوا تو محمود الٰہی صاحب اسلوب احمد کی حمایت میں کمر بستہ ہوئے جس پر مجنوں گورکھپوری اس قدر چراغ پا ہوئے کہ نازیبا باتیں بھی لکھ گئے۔ اس ادبی معرکے کا محور قومی آواز تھا۔ سید محمد عقیل رضوی کو ۲؍جولائی ۱۹۹۵ء کو تحریر ایک خط میں اس معرکہ کا ذکر مختصر طور پر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

' مکتوب گرامی ملا۔ کوئی ۳۰۔۳۵ سال پرانی بات یاد آگئی۔ ''رباعی'' کے مسئلے پر مجنوں گورکھپوری مرحوم سے بحث چھڑی گئی تھی میں نے کسی فارسی کتاب سے ایک قول نقل کیا تھا جس میں لفظ ''پیچیدہ'' آگیا تھا قومی آواز نے بڑے اہتمام سے ''پے چیدہ'' لکھ کر شائع کیا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ مجنوں صاحب یا ان کے ہمنوا اس لفظ کے پیچھے نہ پڑ جائیں ہم نے قومی آواز کو خط لکھا کہ آئندہ اشاعت میں اس

کی تصحیح کردی جائے اس اثنا میں مجنوں صاحب کا جواب شایع ہوا جس میں یہ لفظ کئی بار استعمال ہوا تھا اور ہر جگہ بلا استثنیٰ ''پے چیدہ'' چھپا۔'

'میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ اصلاح کاتب نے کی تھی یا کسی فاضل مدیر نے اب آپ سمجھ سکتے ہیں آج سے ۳۵ سال قبل یہ حال تھا تو ۳۵ سال کے بعد کیا حال ہوگا۔'

اتر پردیش میں محمود الٰہی صاحب کا کردار ہمیشہ سرگرم رہا کیوں کہ وہ خالص ادبی شخص تھے اور بڑی خاموشی کے ساتھ اردو ادب کی آبیاری میں لگے رہتے۔ غالباً اردو اکادمی کا چیرمین اردو والوں میں سے نہ بنا کر کسی دیگر شخص کو بنا دیا گیا ہو یا ایسے شخص کو جو اس کا اہل نہ ہو اس پر موصوف کو جو تکلیف پہنچی اس کا اظہار انہوں نے سید عقیل احمد رضوی کو 1979 کو لکھے خط میں اس طرح کرتے ہیں:

'میں نے پہلی بار چیرمین کا نام سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ کعبۂ اردو پر اس نے حملہ کردیا ہے۔ یقین مانیے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ سب نااہلوں کے درمیان کھڑا کر دیا گیا ہوں۔ اب اس سے زیادہ ہماری اور آپ کی توہین کیا ہوگی؟ ہم اردو والوں میں ایک بھی ایسا نہیں نکلا کہ وہ اردو اکادمی کی صدارت یا چیرمین شپ کا اہل سمجھا جاتا۔'

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں کہ:

'پھر یہ بھی دیکھا کہ ہم میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا بات یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر پروفیسروں میں میں سب سے سینئر ہوں تو یہ بار بھی اٹھانا میرا پہلا فرض ہے پریس کانفرنس بلائی اور ایک بیان جاری کر دیا۔ اس کے بعد خوشی اس کی ہوئی کہ اردو والے اس امر خاص میں مجھ سے کہیں آگے ہیں اور سب نے مشترکہ اقدام کا مشورہ دیا۔'

اور خط کے آخر میں انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کردی کہ:

'یہ سب اہل سیاست کا کیا دھرا ہے ....اور یہ اہل سیاست اپنے اقتدار کی آخری منزل میں ہے۔'

محمود الٰہی صاحب نے مذکورہ باتیں تقریباً ۴۰ سال قبل کہی تھیں جب حالات اتنے خراب نہیں تھے لیکن آج اردو کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حالیہ وقت میں اردو کے سرکاری ادارے پوری طرح سیاست کی گود میں ہیں۔ مرکزی ادارے ہوں یا ریاستی، اس میں سیاست تو دخیل ہے ہی نیم سرکاری اور امداد یافتہ ادارے بھی اس شیطانی سائے سے محفوظ نہیں ہیں۔

چونکہ محمود الٰہی صاحب کے بہت زیادہ خطوط دستیاب نہ ہو سکے اس لیے دستیاب خطوط کو ہی موضوع بنا کر ان کے خطوط نگاری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئندہ اس موضوع پر تفصیل سے کام کرنے کا ارادہ ہے۔

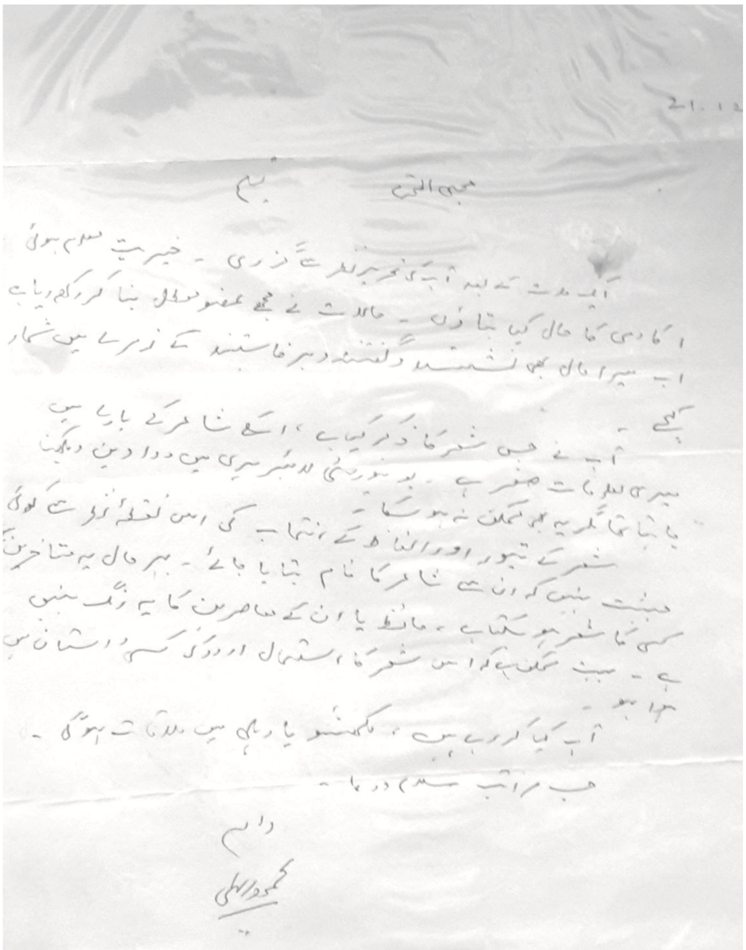

عکس تحریر

□□□

آزادضمیرانصاری
رابطہ: 9335221079

خراج عقیدت

اردو کا جاں باز سپاہی
فخر ادب محمود الٰہی

مردِ قلندر، رشک سکندر ٹھوکر میں تھی نخوتِ شاہی
لاؤ کہیں سے ڈھونڈھ کے اس کی وسعت فکری، ژرف نگاہی
سیرت بھی محمود تھی یارو تھا وہ مجسم صدق و صفاہی
تھا وہ امام الہند کا شیدا جادۂ الفت کا تھا راہی
تعمیر افکار کا حامل پیش نظر تھا دورِ تباہی
نوخیزان اردو ادب کی اس نے سدا کی پشت پناہی
تھا ایثار و وفا کا پتلا کی نہ کسی کی بدخواہی
کبتر علومی اس کی صفت تھی فطرت میں تھی علیم اللٰہی
تحقیق و تنقید و صحافت حرف آخر، اس کی گواہی
فکر تھی اس کی فروغِ اردو تا دمِ آخر کی جانکاہی
عقدہ کشائے حکمت دوراں صاحب سرِّ دانش گاہی
اہل نظر سے فیض اٹھاؤ ہے یہ علاجِ گور نگاہی
علم و عمل کی شمعیں جلاؤ دور کرو باطن کی سیاہی

کون رہا ہے کون رہے گا
قائم و دائم ذات خدا ہی

ظفراقبال ظفرؔ
رابطہ:7379512431

قطعات

الفاظ و معانی کا سمندر انہیں کہیں
اہل ادب کا سکندر انہیں کہیں
ہیں نقد و نظر میں جو کہ اب گوہر نایاب
کیوں نہ ظفرؔ ادب کا سخنور انہیں کہیں

رفعت ہے ملی ان کو ذہانت کے سبب سے
شہرت جو ملی ان کو ہے وہ علم و ادب سے
بے مثل تھے تنقید میں محمود الٰہی
یہ علم کی دولت انہیں حاصل ہوئی رب سے

باب ہفتم

چلتے چلتے

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

ڈاکٹر اکبر علی

ایڈیٹر
روزنامہ 'آگ' لکھنؤ
رابطہ: 6307369930

کسی بھی ملک وقوم کی ترقی کا انحصار بہتر تعلیمی سرگرمی پر ہوتا ہے۔ جس ملک میں تعلیم کا بہتر بندوبست ہوتا ہے وہ کثیر جہتی ترقی کرتا ہے تعلیم یافتہ افراد صرف سائنسی ایجادات پر ہی قادر نہیں ہوتے بلکہ تعلیم سے آراستہ نسل اپنے معاشرہ کو اس قدر پرسکون بناتی ہے کہ ملک بنیادی سہولیات سے آراستہ گہوارہ امن وامان بن جاتا۔ اسکے برعکس جن ممالک میں تعلیم کا فقدان ہوتا ہے وہاں لوگوں کی زندگی دشوار گزار اور امن وچین کے بجائے قتل وغارت گری کا بازار گرم رہتا ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں ہمیشہ تعلیم کی اہمیت رہی ہے زمانہ قدیم میں یہاں اعلیٰ معیاری دانشگاہیں قائم تھیں جہاں طلبا کو صلح کل اور مساوات کا درس دیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے قدروں کا زوال شروع ہوا ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار بھی روبہ زوال ہوتا گیا۔ اب دانش گاہوں اور کالجوں میں تعلیم کو چھوڑ کر سبھی کچھ پڑھایا جاتا ہے یعنی تعلیمی ادارے اپنے مقصد سے بھٹک گئے ہیں۔ اس صورت حال کے لیے طلبا سے زیادہ اساتذہ ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنے طلبا میں حصول علم کی وہ لگن ہی نہیں پیدا کی جو آدمی کو انسان بناتی ہے۔

آج کے زوال آمادہ معاشرہ کے اساتذہ سے قطع نظر جب ہم اپنے دور کے تعلیمی ماحول اور اساتذہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے استاد نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی درس وتدریس بنایا تھا وہ صرف درجات میں ہی درس نہیں دیتے تھے بلکہ وہ چلتی پھرتی تعلیم گاہیں تھے اور وہ ہر وقت اپنے طلبا کی رہنمائی کی فکر کیا کرتے تھے انہیں نادر روزگار اساتذہ میں ایک اہم نام پروفیسر محمود الٰہی صاحب کا ہے خدا نے انہیں بڑی خوبیاں بخشی تھیں،۔ اپنے طلبا کے لیے ان کی شخصیت ایک ایسے سایہ دار شجر کی تھی کہ جو بھی اس کے سایہ میں آتا زمانہ کی سختیوں سے اسے نجات ملتی تھی۔

پروفیسر محمود الٰہی کلاس روم میں ایک شفیق استاد کی طرح اپنے طلبا سے پیش آتے تھے۔ نو واردان کے سامنے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو کئی برس گزر جانے کے بعد منکشف ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی درجات میں اپنی ذات یا علمی کارناموں کے تعلق کبھی گفتگو نہیں کی ان کی کوشش ہوتی

کہ طلبا اور ان کے درمیان کوئی دوری حائل نہ ہو کیونکہ شخصیت کے رعب میں طلبا قربت نہیں محسوس کریں گے اور فریضہ تدریس بہتر طور پر انجام نہیں پا سکے گا۔

استادِ محترم اکثر اپنے لکچر میں علامہ اقبال کا درج ذیل شعر پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ زندگی کی راہ چاہے جتنی خار دار ہو جہد پیہم سے منزلِ مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہ فریاد

ایک بار دوران گفتگو انہوں نے یہ نسخہ کیمیا بتایا کہ جو بھی کتابیں پڑھی جائیں اس کی تخصیص ایک رجسٹرڈ میں نوٹ کر لی جائے اور وقتِ ضرورت رجسٹرڈ کی ورق گردانی کی جائے تو پڑھی ہوئی کتابیں آئینہ ہو جائیں گی۔

یادوں کا لامتناہی سلسلہ ہے کس کس کا احاطہ کیا جائے پروفیسر محمود الٰہی کے شاگرد ہونے پر ہمیں اسی طرح فخر ہے جیسا کہ بقول فراق ان کے ہم عصروں کو فراق کو دیکھنے پر فخر تھا۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
جب بھی ان کو دھیان آئے گا تم نے فراق کو دیکھا تھا

پروفیسر محمود الٰہی جیسی عبقری شخصیت کی شاگردی پر یقیناً ہمیں ناز ہے۔ ایسی شخصیتیں بار بار جنم نہیں لیتی ہیں۔ بقول میر

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے بتائے راستہ پر آگے بڑھیں، علم کے جو امانت ہمیں سونپی ہے۔ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔

جو شاگرد درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ استاد کے نقش قدم پر چل کر اپنے طلبا میں حصول علم کا جذبہ پیدا کریں جو طلبا و درس و تدریس سے وابستہ نہیں ہیں ان سے درخواست ہے کہ استادِ محترم کے یوم وفات پر اپنے اپنے شہروں میں جلسہ منعقد کریں۔ اسی طور ہم اپنی ممنونیت کا اظہار کر سکیں گے۔

❑❑❑

میں نے بار بار اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے کہ میں تحقیق و تنقید کو لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ اگر کسی کے پاس تنقیدی بصیرت نہیں ہے، متن کی ترتیب و تدوین سے لے کر شعراء کے تعین زمانہ تک ہر مرحلے پر وہ ناکام رہے گا۔ اسی طرح محققانہ نگاہ کے بغیر وہ مختلف انداز و اسالیب میں امتیاز نہیں کر سکے گا۔

تحقیق کا مطلب یہ نہیں کہ چند قلمی نسخوں کو فراہم کر لیا جائے اور ان پر تعارفی نوٹ لکھ دیا جائے یا مختلف نسخوں میں نقطوں کا جو فرق ہے اسے واضح کر دیا جائے۔ اسی طرح تنقید کا مفہوم یہ نہیں کہ کسی تخلیق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا جائے۔ تحقیق نام ہے حقائق کی تلاش اور ان کی بازیافت کا۔ حقائق و مسلمات کی تعبیر نو بھی تحقیق کے ذیل میں آتی ہے۔ اس طرح تنقید میں اقدار کا ابلاغ اور اخلاق کے ذہن کو بے نقاب کرنا پڑتا ہے۔ غالبؔ کے استعاروں کو سمجھنے کے لئے غالبؔ کی ذہنی ساخت کو اور اس میں ترک و قبول کی جو صلاحیت تھی اسے اور اس کے عوامل کو سمجھنا بھی لازم ہے۔ افہام و تفہیم کے یہ مرحلے اسی وقت طے ہو سکتے ہیں جب تنقید و تحقیق کے رشتے کو چولی دامن کے رشتے کا مصداق بنا دیا جائے۔

میرے جو مضامین اور کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں میرے اس ملک کی نشاندہی ملے گی کہ میں ان گوشوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جس سے اردو ادب کی تاریخ میں وسعت آتی ہے۔ میں یا تو مسلمات کی تردید کرتا ہوں یا ان کی نئی تعبیر پیش کرتا ہوں۔ میں طریقہ راسخہ کا مخالف نہیں ہوں لیکن میں اس کی اندھی تقلید بھی نہیں کرتا۔ میں نئے حقائق کی روشنی میں اس کی ثقافت و استناد کا جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر اس عمل میں مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں مگر کبھی کبھی نئے دلائل سے بعض مسلمات کو میں نے مشکوک بنا دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہاں چند مثالوں سے اس کی وضاحت کروں گا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نذیر احمد ہمارے بڑے ناول نگاروں میں ہیں لیکن مجھے انہیں ناول کا مؤسس ماننے میں تامل تھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ ہمارے یہاں قصے کی روایت نے یکا یک داستان کے لبادے کو اتار کر ناول کا پیرہن زیب تن نہیں کیا۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ قصے کے فن نے مرحلے وار سفر کیا ہوگا اور داستان و ناول کے مابین کچھ اور کڑیاں رہی ہوں گی، میں انہیں گمشدہ کڑیوں کو تلاش کر رہا تھا اور کریم الدین کی 'خط تقدیر' کی بازیافت سے میرے خیال کو اور بھی تقویت ملی یہاں تک کہ اب 'مرأۃ العروس' سے پہلے کے بعض اور قصوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مستقبل قریب میں داستان اور ناول کے درمیان کی ایک ایک کڑی تلاش کر لی جائے گی۔

(پروفیسر محمود الٰہی کے مضمون ادبی سفر- میری تحقیق و تنقید کا سے ماخوذ)

میرے کتابی استاد: پروفیسر محمود الٰہی

صالحہ صدیقی

ریسرچ اسکالر

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

رابطہ: 9899972265

استاد ضروری نہیں گوشت پوشت کا انسان ہو جو کلاس روم میں بلیک بورڈ کے سامنے کھڑے ہو کر آپ کو پڑھائے۔ میرے نزدیک استاد وہ بھی ہے جو اپنی کتابوں کے ذریعہ نسل در نسل طلباء کی رہنمائی کرتا رہے۔ میرے ایسے ہی عزیز استادوں کی فہرست میں ایک اہم نام محمود الٰہی صاحب کا بھی ہے۔ محمود الٰہی میرے کتابی استاد رہے ہیں، جن سے میری پہلی ملاقات ان کی کتاب ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' سے ہوئی۔ ان کی اس کتاب کے ذریعہ ہی میں قصیدہ کے فن اور اس کی تاریخ اور قصیدہ کے فنی زیر و بم سے واقف ہو پائی۔ میں نے الٰہی صاحب کو نہ دیکھا اور نہ انھیں کبھی سننا نصیب ہوا لیکن ان سے ایک قلبی و ذہنی رشتہ ضرور بن گیا۔ ان کا نام آتے ہی مجھے ان کی اس کتاب کا نام ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ آج میں خود کو بہت خوش قسمت محسوس کر رہی ہوں کی اپنے کتابی استاد پر کچھ لکھنے کا موقع مجھے سلیم صاحب کے سہ ماہی رسالے (ادبی نشیمن) کے ذریعہ مل رہا ہے۔

محمود الٰہی صاحب کی خدمات اور ان کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کا جائزہ لینے سے قبل ان کے بارے میں جاننا اہم ہے تبھی ہم صحیح معنوں میں ان کی تصانیف کو سمجھنے میں کامیاب ہو پائیں گے۔ یوں تو تحقیق و تنقید نگاری کے حوالے سے محمود الٰہی کی شخصیت اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی تصانیف کی اشاعت نے خود ہی یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی تصانیف نہ صرف عصری تحقیق و تنقید کی عکاس ہے بلکہ قاری کے فکری ذہن کے دریچوں کو بھی کھولتی ہیں۔ پھر بھی ان کی تحقیق و تنقید نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ان کی سوانح پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ کسی بھی مصنف یا تخلیق کار کو عام انسان سے تخلیق کار بننے میں اس کی ذاتی زندگی، عہد و ماحول، اس کے معاشرے کے حالات و واقعات کے اثرات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ محمود الٰہی صوبہ اتر پردیش کے ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر میں ۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا علیم اللہ وہاں کے معروف مدرسہ ''مدرسہ کنز العلوم'' کے بانی و استاد تھے۔ محمود الٰہی کے تعلیمی سفر کا آغاز پانچ سال کی عمر میں مقامی اسکول سے ہوا اور میٹرک تک کی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔

اس کے بعد وہ آگرہ چلے گئے اور آگرہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انہوں نے بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر ۱۹۵۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال انھیں گورنمنٹ کالج رامپور میں اردو لکچرر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی بحیثیت استاد تقرر ہوا اور یہیں سے ۱۹۹۱ء میں پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اپنے درس و تدریس کے کام سے وابستگی کے دوران آپ تین مرتبہ اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین بھی منتخب کیے گئے، جہاں انھوں نے اپنی بے لوث خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ اپنے گھر واپس چلے آئے اور مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔

ادب ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے خواب و خیال، احساسات وجذبات، مسرت و غم، اپنی خواہشوں اور محرومیوں کے ساتھ اپنی زندگی کے حقیقی تجربات کی عکاسی و ترجمانی کرتا ہے۔ محمود الٰہی کا شمار بھی اردو کے ممتاز تحقیق و تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت کم وقت میں اپنی قابلیت اور فنی بصیرت، اپنے انوکھے انداز، تکنیک، ہیئت اور موضوعات و تلازمات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر اردو ادب کی دنیا میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔

محمود الٰہی صاحب کے ادبی کارناموں کی اگر بات کریں تو ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ''، محمود الٰہی کا لافانی کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے قبل اردو قصیدہ نگاری کے سلسلے میں بس مایوسی ہی ہاتھ آتی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل اس صنف کے سلسلے میں کوئی منظم تاریخ نہیں دیکھنے کو ملتی۔ محمود الٰہی نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ حالانکہ اس کتاب سے قبل ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتاب ''اردو میں قصیدہ نگاری'' منظر عام پر آ گئی تھی لیکن محمود الٰہی کے اس کارنامے کے بعد اردو قصیدہ نگاری کے باب میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوا۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو آٹھ باب میں منقسم کیا ہے جن میں صنف قصیدہ کی تعریف، عربی و فارسی قصیدوں کا مطالعہ، دکن میں اردو قصیدے کی روایات، شمالی ہند میں اردو قصیدہ نگاری کا ارتقاء، سودا کے قصائد پر سیر حاصل بحث، سودا کے معاصرین کا تذکرہ، ذوق، مومن، غالب، جیسے ممتاز قصیدہ نگاروں کے متعلق بے شمار گوشوں کو منور کیا گیا ہے۔ سچی تنقید بھی وہی ہے جو زمانہ قدیم کے عظیم فنکاروں کی بالترتیب درجہ بندی اور رتبہ شناسی کرے ساتھ ہی زمانہ جدید کی تخلیقات کو بھی شامل حال رکھے۔ محمود الٰہی نے اپنی اس کاوش میں ان باتوں کو ملحوظ خاص رکھا ہے۔ تحقیق و تنقید کے سلسلے میں ہاب اشرفی نے ایک مقام پر یوں کیا ہے فرماتے ہیں:

> ''کسی بھی شاعر یا فنکار یا دوسرے شاعر کی اہمیت واضح کرنے سے پہلے نقاد پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ واضح کرے کہ اس کے پاس پرکھ کے معیار کیا کچھ ہیں؟ تنقیدی کسوٹی کیا ہے؟ استدلال کن بنیادوں پر قائم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے امور ہیں جس سے کسی فن پارے کی بنت میں اترنے کا راستہ ہموار ہوتا ہے ورنہ رائے محض تو کوئی بھی قائم کر سکتا ہے، اس میں تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کی کیا ضرورت؟ گویا سب سے پہلے نقاد کو خود اپنی تنقید کی بوطیقا سے واقف ہونا چاہیے، پھر اسے اس کے نکات کی عملی صورت اجاگر کرنے پر قدرت بھی۔ تب ہی تنقیدی وقار حاصل ہو سکے گا، تنقید رائے زنی نہیں

محمود الٰہی صاحب کے ادبی کارناموں کی اگر بات کریں تو ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ''، محمود الٰہی کا لافانی کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے قبل اردو قصیدہ نگاری کے سلسلے میں بس مایوسی ہی ہاتھ آتی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل اس صنف کے سلسلے میں کوئی منظم تاریخ نہیں دیکھنے کو ملتی۔ محمود الٰہی نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ حالانکہ اس کتاب سے قبل ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتاب ''اردو میں قصیدہ نگاری'' منظر عام پر آ گئی تھی لیکن محمود الٰہی کے اس کارنامے کے بعد اردو قصیدہ نگاری کے باب میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوا۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو آٹھ باب میں منقسم کیا ہے جن میں صنف قصیدہ کی تعریف، عربی و فارسی قصیدوں کا مطالعہ، دکن میں اردو قصیدے کی روایات، شمالی ہند میں اردو قصیدہ نگاری کا ارتقاء، سودا کے قصائد پر سیر حاصل بحث، سودا کے معاصرین کا تذکرہ، ذوق، مومن، غالب، جیسے ممتاز قصیدہ نگاروں کے متعلق بے شمار گوشوں کو منور کیا گیا ہے۔ سچی تنقید بھی وہی ہے جو زمانہ قدیم کے عظیم فنکاروں کی بالترتیب درجہ بندی اور رتبہ شناسی کرے ساتھ ہی زمانہ جدید کی تخلیقات کو بھی شامل حال رکھے۔ محمود الٰہی نے اپنی اس کاوش میں ان باتوں کو ملحوظ خاص رکھا ہے۔

ہے ،نکتہ رسی اور نکتہ شناسی ہے ،اور یہ کام مشکل ہے ۔اس لئے کہ اس کے مطالبات بہت کچھ ہیں۔''

شاعری کا فن بڑی نزاکت و لطافت کا فن ہے اور شاعری کا بنیادی تعلق شاعر کی شخصیت اس کے فکر و خیال اور طبیعت و مزاج کی افتاد سے ہوتا ہے ۔جیسا کہ خلیل الرحمن اعظمی نے ایک مقام پر لکھا ہے۔

''شعر و ادب کا تعلق بنیادی طور پر شاعر وادیب کی شخصیت ،اس کے مزاج ،اس کی افتادِ طبع اور اس کے تجربات ومحسوسات کی نوعیت سے ہے ۔یہ تجربات ومحسوسات جس قدر حقیقی ہوں گے ،ان کی جڑیں زندگی میں جتنی گہری ہوں گی اور اس کا رشتہ شاعر و ادیب کی اصل شخصیت اور اس کی افتادِ طبع سے جتنا فطری اور حقیقی ہوگا۔اسی اعتبار سے وہ فن پارے کی تخلیقی صلاحیت کو پورا کرنے کے قابل ہوگا اور اس کی تحریروں میں وہ آب و رنگ پیدا ہو سکے گا جن کی بدولت ان کی تاثیر دیر پا اور مستقل حیثیت کی حامل ہوگی۔''

مذکورہ اقتباس کے تناظر میں بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمود الٰہی کو فن شاعری سے خاصی انسیت تھی اور اس صنف سے ان کی شخصیت میں بڑی ہم آہنگی نظر آتی ہے ۔ان کے محسوسات وتجربات میں بھی حقیقت پسندی اور ان کی شاعری کا رشتہ زندگی کی افتادِ طبع سے بھی مستحکم اور مضبوط ہے انھوں نے جس طرح قصیدہ کی دنیا کو اردو شاعری سے متعارف کرایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس صنف شاعری سے کس طرح ذہنی و قلبی دلچسپی رکھتے تھے۔

محمود الٰہی کا ایک اور اہم کارنامہ ''بازیافت'' ہے ۔جو ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ۔یہ کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ۔اس کتاب میں شامل مضامین میں اردو میں جدید تحقیق کا آغاز طبقات شعرائے ہند،اردو ڈراما اور انارکلی ،مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم اخبار ،ناسخ کا دیوان دوم ،شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک اور نثری کارنامہ ،تذکرہ بہار سنگھ ،اردو میں عربی شعرا کا پہلا تذکرہ ،مقدمہ تذکرۂ شورش اور احتشام حسین بحیثیت نقاد قابل ذکر ہیں ۔اس مجموعہ میں شامل تمام مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں ۔جس میں بے حد معلوماتی گفتگو کی گئی ہے ہر مضمون ایک نیا انکشاف کرتا ہے ۔محمود الٰہی بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے تقاضوں کی روشنی میں شعر و ادب کو پرکھنے کے قائل تھے ۔وہ زمانی تغیرات کو نظر انداز نہیں کرتے تھے ۔کیونکہ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہر عہد کی تفہیم بدلتے وقت و حالات میں مختلف ہو جاتی ہے ،آج جو حالات ہمارے سامنے ہیں وہ ماضی میں جس معنویت کا حامل تھا آج وہ بالکل مختلف ہے ،لہٰذا ہمیں نئی تفہیم کے ساتھ چیزوں کو پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔اس لیے ہمارے کلاسیکی شاعروں کو بھی آج کے حالات و واقعات کے مطابق از سر نو پرکھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

محمود الٰہی کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے انھوں نے نثری وشعری دونوں ہی صنف میں نئے نئے انکشافات کیے ۔اسی طرح ان کا ایک اہم کام تحقیقی نقطۂ نظر سے اردو فکشن میں ''فسانہ عجائب'' سے متعلق ہے ۔ان کے خیال میں یہ داستان اردو نثر کی فطری نشوونما کا ایک حصہ نہیں ہو سکی ایک مدت کے بعد محمود الٰہی کو اس کتاب کا ایک خطی نسخہ دستیاب ہوا جس سے بہت سی متعلقہ باتیں غلط ثابت ہو جاتی ہیں ۔محمود الٰہی نے دستیاب نسخے کی از سر نو تحقیق کی اور کافی جدوجہد کے بعد اس متن کو شائع کیا اور ''فسانۂ عجائب کا بنیادی متن'' نام رکھا۔

اسی طرح میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعراً'' جسے اردو کا پہلا تذکرہ مانا جاتا ہے اس سلسلے میں بھی محمود الٰہی نے اہم تحقیقی کام انجام دیا ۔محمود الٰہی نے اسے پہلا تذکرہ نہ مانتے ہوئے اس سے قبل لکھے گئے تذکروں کی تحقیق کی ۔شمالی ہند میں لکھے گئے تذکروں میں نکات الشعرا کے علاوہ ''تذکرہ ریختہ گویاں'' اور ''مخزن نکات'' کو قدامت کے لحاظ سے اولیت دی ۔ان کی تحقیق کے مطابق یہ تینوں تذکرے ایک ہی زمانے میں لکھے گئے ۔اس سلسلے میں کافی طویل بحث و مباحث بھی ملتے ہیں جس کے ذریعہ انھوں نے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ان کے اس طرح کے اور بھی تحقیقی کارنامے ہیں مثلاً صحیفۂ محبت (مہدی آفادی)، دستاویز :انتخاب تذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد)،طبقات شعرائے ہند (مولوی کریم الدین)،خلافت کانفرنس ،خطبہ صدارت ،انتخاب نثر ،انتخاب نظم ،انتخاب غزلیات ،انتخاب ہمدرد، وغیرہ۔ان تمام تحقیقی کارناموں کے ذریعہ محمود الٰہی نے بے شمار اردو نثر و نظم کے گوشے منور کیے ۔محمود الٰہی کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''...ڈاکٹر محمود الٰہی اردو کے ان اہل قلم کی صف میں داخل ہو چکے ہیں جن کو ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کے

اعتبار سے ممتاز درجہ حاصل ہے۔

(بازیافت: ڈاکٹر محمود الٰہی، ص، ۲۲۳)

ان کا یہ کہنا جائز بھی تھا کیونکہ جس عرق ریزی سے انھوں نے اپنے تحقیقی کارنامے انجام دیے اس سے اردو تحقیق کی دنیا میں نئے اضافے ہوئے۔رشید احمد صدیقی بھی ان کی انھیں صلاحیتوں کے دلدادہ تھے۔محمود الٰہی کے سلسلے میں اپنا یہ خیال انھوں نے اس وقت ظاہر کیا تھا جب ان کے مطالعہ کی میز پر مولوی کریم الدین کی کتاب ''خط تقدیر'' رکھی تھی۔جو محمود الٰہی کے تحقیقی کاوش کا ثمرہ تھی۔یہ کتاب مولوی کریم الدین نے ۱۸۶۲ء میں لکھی تھی۔ایک سو برس گزر جانے کے بعد محمود الٰہی نے اس کا متن دریافت کیا اور اسے مرتب کر کے دوبارہ شائع کیا۔جس کے بعد اردو ادب کے بڑے حلقے میں بحث و مباحث کا ایک نیا دور شروع ہوا انھوں نے اس کتاب کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا۔اس فہرست میں رشید احمد صدیقی بھی شامل تھے اور انھوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا جس میں محمود الٰہی کی ناقابل فراموش خدمات کا اعتراف بھی کیا۔بہر حال محمود الٰہی کا ہر کام لافانی ہے اور آج بھی ہر طالب علم کے لیے سودمند ہے۔ادب کی ہر عہد میں اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب اشرفی اپنے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعے ''آگہی کا منظرنامہ'' (۱۹۸۹ء) کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ:

''ادب کو سڑنا گلنا نہیں ہے تو اس کی تازگی برقرار رکھنا پڑے گی اور اس کے لیے عالمی سطح پر ادبی رویوں کے تبدل وتغیر پر نگاہ رکھنی پڑے گی اور اس کے لیے وسیع اور گہرے تقابلی مطالعے کا چیلنج قبول کرنا پڑے گا، ورنہ ادبی تفہیم کا لامتناہی پس منظر آنکھوں سے اوجھل رہے گا اور اگر ایسا ہوا تو پس ماندگی مقدر بن جائے گی۔میرا موقف یہ ہے کہ جہاں ادب کے کچھ مقامی مطالبات ہیں تو گویا اس کی کاوش ہے کہ وہ اپنے ادب کو نئے رنگ و روغن دے کر اسے عالمی سطح پر لا کھڑا کرے۔''

محمود الٰہی کا ایک اور اہم کارنامہ ''بازیافت'' ہے۔جو ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔یہ کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں شامل مضامین میں اردو میں جدید تحقیق کا آغاز طبقات شعرائے ہند، اردو ڈراما اور انارکلی، مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم اخبار، ناسخ کا دیوان دوم، شاہ رفیع الدین دہلوی کا ایک اور نثری کارنامہ، تذکرہ بہار سنگھ، اردو میں عربی شعرا کا پہلا تذکرہ، مقدمہ تذکرۂ شورش اور احتشام حسین بحیثیت نقاد قابل ذکر ہیں۔اس مجموعہ میں شامل تمام مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں۔جس میں بے حد معلوماتی گفتگو کی گئی ہے ہر مضمون ایک نیا انکشاف کرتا ہے۔محمود الٰہی بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے تقاضوں کی روشنی میں شعر و ادب کو پرکھنے کے قائل تھے۔وہ زمانی تغیرات کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔کیونکہ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہر عہد کی تفہیم بدلتے وقت و حالات میں مختلف ہو جاتی ہے، آج جو حالات ہمارے سامنے ہیں وہ ماضی میں جس معنویت کا حامل تھا آج وہ بالکل مختلف ہے، لہٰذا ہمیں نئی تفہیم کے ساتھ چیزوں کو پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اس لیے ہمارے کلاسیکی شاعروں کو بھی آج کے حالات و واقعات کے مطابق ازسرنو پرکھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

بلا شبہ محمود الٰہی اردو تنقید نگاری کا وہ نام ہے جنھوں نے اس کی سمت و رفتار کو نیا موڑ دیا۔عالمی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ عالمی تنقید کے جدید رجحانات سے پوری طرح باخبر تھے۔اسی لیے ان کی تنقید میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔تنقید کا قدیم مشرقی انداز انھیں پسند نہ تھا وہ تجزیہ و تحلیل سے کام لینے کے عادی تھے۔انھوں نے تاعمر بنا کسی مفاد کے اردو کی خدمت اور اس کی آبیاری کیں اور زیادہ وقت تحقیق و تنقید میں گزارا۔محمود الٰہی حیات و خدمات یقیناً ایک وسیع موضوع ہے، ان کے طویل ادبی سفر کو چند صفحات میں سمیٹنا اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالنا یقیناً ممکن نہیں، کہیں نہ کہیں تشنگی کا احساس باقی رہ جانا فطری بات ہے۔پھر بھی میں نے حتیٰ الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اس موضوع کے ساتھ انصاف کر سکوں جس کے لیے میں نے تمہید کے ساتھ اصل موضوع کی طرف رخ کرنا مناسب سمجھا۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ محمود الٰہی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے جو صدیوں میں جنم لیتے ہیں آج بھلے ہی وہ ہمارے درمیان موجود نہ ہو لیکن ان کی تحریریں ہمیشہ ہم طالب علموں کے لیے مشعل راہ بنی رہیں گی اور نسل در نسل اردو طلباء وطالبات کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔میں اپنی باتوں کا اختتام اقبال کے اس شعر کے ساتھ کرنا چاہوں گی:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

□□□

زیر نظر کتاب اردو فکشن کے پانچ رنگ فکشن پر کام کرنے والوں کے لئے بہت ضروری ہے مواد فراہم کرتی ہے۔ یہ کتاب اردو قاری کو داستانوں سے لیکر افسانچے تک ایک مکمل دستاویز ہے۔ یہ کتاب تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اردو داستان پر ایک محاکمہ سے کتاب کی شروعات ہوتی ہے۔ داستانوں پر ایک مختصر نوٹ پیش کیا گیا ہے مگر اس کے بعد اردو کی دو داستانیں سب رس اور باغ و بہار پر مختصر نوٹ کے ساتھ داستانوں کی جانکاری قاری کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ داستان کی ابتدایہ کے طور پر منظوم اور نثری داستانوں کی تفصیل ریسرچ اسکالرز کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔ ناولوں کے ذکر میں کچھ انوکھے موضوعات کو شامل کیا گیا ہے جس میں صالحہ عابد حسین کا ذکر بطور خاص ضروری ہے کہ اردو میں اس بڑے ناول نگار کی تخلیقات کو ترقی پسندی کی آندھی نے اردو فکشن کی تاریخ سے کاٹ دیا۔ ڈاکٹر اسلیم جمشید پوری نے صالحہ عابد حسین کے کارناموں کو بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے ۔ناولوں کے کینٹینٹ Content میں جمشید پوری نے کرشن چند کے ناولوں میں رومانیت، اردو ناول کی سمت و رفتار اور خاص طور سے 1960 کے بعد کے خواتین ناول نگاروں پر اچھا مواخذہ کیا گیا ہے۔ 21 صدی کے اردو ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جمشید پوری نے شروعات کے 15 سالوں میں معاشرے میں تیزی ہو رہی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ اس صدی کے شروعاتی 15 سالوں میں تقریباً 50 بہترین ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں شمس الرحمن فاروقی کے ناول کئی چاند تھے سر آسماں جیسے ناول بھی ہیں۔ جس نے اردو میں قرۃ العین حیدر کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اسی طرح بالکل نئی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے مشرف عالم ذوقی نے کاردار خاندان پر ایک دلچسپ ناول لکھا ہے۔ لے سانس بھی آہستہ کو اسلم جمشید پوری صاحب چونکانے والا ناول کہتے ہیں۔ اسے دیکھنے کے بعد مجھے وکرم سیٹھ کا انگریزی ناول A Suitable Boy (1993) جس کا ہندی ترجمہ ایک اچھا سا لڑکا ہے کی یاد آجاتی ہے۔ جس نے ناولوں کی دنیا میں دھمال مچا دیا تھا۔ لے سانس بھی آہستہ نے اردو میں خاصی ہلچل مچائی ہے۔ اس کتاب میں امراؤ جان،

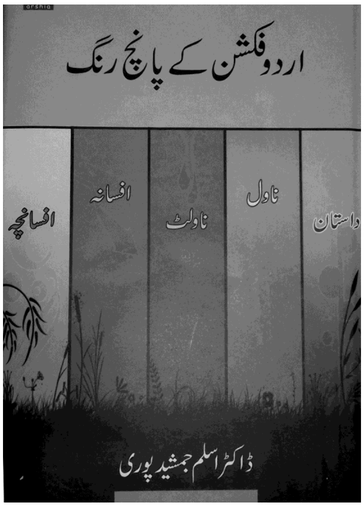

مصنف : ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

مبصر : شاداب اختر فلاحی

قیمت : 600 روپئے

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ملنے کا پتہ : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

چاندنی بیگم، بہت دیر کردی، چاند گہن عزازیل لیمینیٹیڈ گرل اور آخری سواریاں پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔

ناولوں کے باب میں جمشید پوری صاحب نے صادقہ نواب سحر کے 2009 میں شائع ناول کہانی کوئی سناؤ متاشا کا ذکر کیا ہے۔ اس ناول کو انہوں نے ایک منفرد ناول قرار دیا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے ناولٹ میں سجاس ظہیر کا ناولٹ لندن کی ایک رات جوگندر پال کے بیانات اور نصرت شمشی کے اوڑھنی کو قابل ذکر سمجھا ہے۔ ان کے سامنے طوالت کا بھی مسئلہ رہا ہوگا۔ عینی آپا کے کی ناولٹ نگاری اور اردو ناولٹ نگاری کا آغاز و ارتقاء بھی بھرپور مضمون ہیں۔ اول کی طرح افسانوں پر بھی اس کتاب میں اچھا کام کیا گیا ہے۔ اردو افسانوں کے آغاز و ارتقاء سے لیکر اکیسوی صدی کے اردو افسانہ تک جمشید پوری کی اچھی گرفت ہے۔ انہوں نے اس سے قبل بھی افسانوں کے موضوعات پر اچھا کام کیا ہے۔ اردو کے غیر مسلم افسانہ نگاروں کے لئے الگ باب دیا گیا ہے۔ خاص طور سے کرشن چندر کے افسانوں میں تقسیم کے المیہ کے حوالے سے جامع نوٹ ہے۔ افسانوی مواخذہ میں جمشید پوری نے آدھا درجن افسانوں پر تجزیہ کیا ہے۔ اس میں انتظار حسین کا افسانہ نرناری، جوگندر پال کا افسانہ بیک لین، نعیم کوثر کا افسانہ رتی لال، نور الحسنین کا کلمہ گو، نگار عظیم کا گہن اور مشتاق احمد نوری کا جادوگر شامل ہے۔

اس کتاب میں جیسا کہ معلوم ہے افسانچے کو بھی ایک صنف کے طور پر پیش کیا ہے۔ جمشید پوری نے اردو افسانچے کے آغاز و ارتقاء پر غور کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جدید افسانچے میں عصری حسیت اور دس منتخب افسانچوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ضمیمہ کے طور پر عینی آپا کے فکشن پر پر مغز نوٹ ہے جو قاری کے لئے اچھا مواد دستیاب کراتا ہے۔ اس کے علاوہ 2015 کا فکشن ایک جائزہ اور 2016 کا فکشن ایک جائزہ بھی کیا گیا ہے۔ اردو فکشن کے پانچ رنگ ایک دستاویزی اساسہ ہے۔ اس میں کتابت کی چند غلطیاں نکال دی جائیں تو ناول کی طباعت اور اشاعت بے حد شاندار ہے۔ کتاب بے حد خوبصورت چھپی ہے۔ کاغذ بہترین ہے۔ قیمت ضرور زیادہ ہے مگر جتنی اچھی طباعت اور بائنڈنگ کی گئی اس کی وجہ سے قیمت میں اضافہ گراں نہیں گزرتا۔

❑❑❑

غلام نبی کمار ان نوجوان قلم کاروں کی صف میں کھڑے ہیں جنھیں ادب کی نئی منزلوں کا پتہ ہے۔ پیش نظر کتاب ''اردو کی عصری صدائیں'' کو غلام نبی کمار نے اپنے تحقیقی وتنقیدی مضامین سے سجایا، سنوارا ہے۔ 368 صفحات پر محیط اس کتاب میں 75 مضامین ہیں۔ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے انھوں نے پوری کتاب کو آٹھ ابواب مثلاً ''تحقیق وتنقید کے شوشے گوشے، رواں صدی کی رواں شاعری، عصری فکشن کے جھلملاتے ستارے، باب خودنوشت نگاری، باب مکتوب نگاری، باب ادب اطفال، باب فن تبصرہ نگاری اور رواں صدی کی ادبی صحافت'' میں تقسیم کیا ہے۔ غلام نبی کمار فی الوقت دہلی یونی ورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے پڑھنے لکھنے کی طرف بھی خوب توجہ دی۔ جس کی بنیاد پر انھیں اردو کے سنجیدہ اور محنتی اسکالروں میں شمار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے چند برسوں میں اپنی تحریروں سے پوری اردو دنیا کو بہت کم وقت میں اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دائرہ نظر کو وسیع کرتے ہوئے کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے ساتھ مضبوط رشتہ استوار کیا ہے۔ غلام نبی کمار نوجوان نسل میں انتہائی فعال اور متحرک ہیں۔ عہد حاضر کے معتبر رسائل و جرائد میں ان کے تبصرے اور مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر قمر جہاں، ظہیر غازی پوری، ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر عباس رضا نیر، شوکت پردیسی، حسن نعیم، اسلم مرزا، سلام بن رزاق، دیپک بدکی، ڈاکٹر معصوم شرقی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، احمد جاوید، آفاق عالم صدیقی، خورشید حیات، کلیم حاذق، اشتیاق سعید، افضال عاقل، ابرار احمد اجراوی، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر یوسف رامپوری، ڈاکٹر حنا آفرین وغیرہ جیسے ادبا پر مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے باقی گوشوں میں بھی اکیسویں صدی کے اہم ادیبوں، شاعروں، فکشن نگاروں اور صحافیوں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

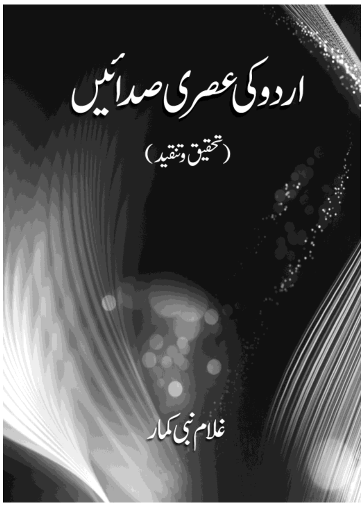

مصنف : غلام نبی کمار

مبصر : ڈاکٹر منصور خوشتر

قیمت : 400 روپئے

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

''اردو کی عصری صدائیں'' کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا مطالعہ کس قدر گہرائی سے کیا جاسکتا ہے اور اس سے کس قسم کے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ان مضامین سے مصنف کے تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ غلام نبی کمار کا اسلوب بیان بہت سادہ اور دلچسپ ہے جو قاری کو مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور مضامین کے مطالعہ میں دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں مصنفیں ومرتبین کے تنقیدی، تحقیقی اور تالیفی خوبیوں اور خامیوں کی بڑی غیر جانبداری سے وضاحت کی ہے۔

پروفیسر صادق اپنے تقریظ میں لکھتے ہیں:

> ''غلام نبی کمار اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں روشن ہونے والا ایک ایسا نام ہے جسے عہد حاضر میں اردو کے بیشتر نئے اور پرانے لکھنے والے جانتے ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے تبصرے اور مضامین گذشتہ چند برسوں سے ہندو پاک کے مختلف رسائل و جوائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔''

اپنی کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے غلام نبی کمار یوں رقمطراز ہیں کہ ''اردو کی عصری صدائیں'' میں مختلف موضوعات اور اصناف کی کتابوں پر پچھتر تبصرے نما مضامین شامل ہیں۔ جو رواں صدی کی شائع شدہ کتابوں پر تحریر کیے گئے ہیں اور ان کتابوں کے قلم کار اور ادیب و شاعر حضرات بھی اسی عہد کے ہیں۔ اس کتاب کے تمام مضامین ہندوستان کے موقر رسائل اور اخبارات میں مختلف اوقات میں شائع ہو چکے ہیں جن میں اردو دنیا، آجکل، ایوان اردو، کتاب نما، پیش رفت، تریاق، شیرازہ، اردو بک ریویو، دربھنگہ ٹائمز، تحقیق دربھنگہ، ثالث، عالمی میراث اور ہماری زبان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔''

کتاب کے فلیپ پر معروف نقادر حقانی القاسمی اور ڈاکٹر مشتاق عالم قادری جبکہ بیک کور پر پروفیسر عبدالستار ردلوی کی تحریروں نے کتاب کی اہمیت مزید بڑھا دی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کتاب نے اردو کے معروف ادیبوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی ہے۔ اس لیے امید کی جا سکتی ہے کہ کتاب ''اردو کی عصری صدائیں'' اردو حلقے میں خوب پذیرائی ہوگی۔

□□□

ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ ملا ہے اس کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں ۔آپ کا اداریہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ ریاست اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے ہوئے تین دہائیاں گزر گئیں مگر عملی طور پر اردو اب بھی بہت ساری سرکاری رعایتوں اور حقوق سے محروم ہے ۔اس پر یقینی طور پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اس شمارے میں حقانی القاسمی کا انٹرویو قابلِ مطالعہ ہے ،انہوں نے اپنے انٹرویو میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے بہت سی کار آمد باتیں کی ہیں۔ازس میں کوئی شک نہیں کہ حقانی القاسمی ہماری نئی نسل کے قابلِ ذکر اور اہم نقاد ہیں اور اپنی تنقیدی صلاحیتوں کے سبب اپنے معاصرین میں بہت نمایاں ہیں ۔ڈاکٹر رشید اشرف خان نے شمس الرحمٰن فاروقی کیا فسانوی مجموعے سوار اور دوسرے افسانے میں شامل افسانوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے مگر یہ تنقیدی جائزہ سرسری ہی کہا جائے گا ۔دراصل شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے ایک گہری معنویت اور وسیع فکری اور تخلیقی نظام سے عبارت ہیں اور ایک تفصیلی جائزے کے متقاضی ہیں۔غلام نبی کمار ہماری تازہ کار نسل کے ابھرتے ہوئے قلم کار ہیں با صلاحیت ہیں ان سے مجھے بہت سی امیدیں ہیں اور یقین بھی کہ وہ مستقبل کے ایک قابلِ ذکر ناقد کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوں گے ۔یعقوب یاور کی غزل گوئی پر ان کا مضمون ایک بالکل نئے انداز کا ہے اور یعقوب یاور کی غزلوں کے داخلی اور تخلیقی نظام کو سمجھنے کی ایک کامیاب کوشش ۔ریسرچ اسکالر توصیف بریلوی کو بھی مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے زبیر رضوی کی نظموں میں نئے زاویوں کی تلاش کا عمل شروع کیا ہے۔غزلوں کے باب میں عبرت مچھلی شہری اور عبدالحئی پیام انصاری کی غزلیں قابلِ توجہ ہیں مگر غزلوں کے انتخاب میں اب بھی محنت کی ضرورت ہے۔پرندہ پکڑنے والا ،احمد رشید علیگ کا افسانہ متاثر کرتا ہے۔مجموعی طور پر ادبی نشیمن کا ادبی سفر کامیاب ہے جس کے لئے آپ کی لگن محنت اور اردو دوستی کو سلام۔

سلیم انصاری

(جبل پور)

●

سب سے پہلے میں آپ کو’ادبی نشیمن‘ کی اشاعت اور ادارت کا ایک سال مکمل ہونے پر دلی مبارک باد پیش کر رہا ہوں۔قارئین کے لحاظ سے ادبی نشیمن کا نیا قاری ہوں۔ابھی مجھے صرف دو ہی رسالہ ستمبر تا نومبر ۲۰۱۸ اور دوسرا دسمبر ۲۰۱۸ تا فروری ۲۰۱۹ نظر نواز ہوا مگر ان دو رسالوں نے مجھے’ادبی نشیمن‘ کا گرویدہ بنا دیا۔اس میں شامل مشتملات یقیناً قابل قدر ہیں۔ادبی رسائل میں ’ادبی نشیمن‘ نئے اور پرانے لکھاریوں کا سنگم ہے۔دسمبر تا فروری ۲۰۱۹ کے اداریے’نظریہ‘ میں اردو زبان کی ترقی و تحفظ کے تعلق سے مدیر نے بڑے کام کی بات ہمارے سامنے رکھی ہے جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ادارت کے زیر اہتمام رسالہ کے اندر جو نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں ،ان سے اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہے اور لگتا ہے کہ ہم ادبی نشیمن کے روپ میں نیا دور پڑھ رہے ہیں۔جناب وصی اللہ حسینی نے حقانی القاسمی کے ساتھ اپنے انٹرویو میں جتنے معقول سوالات کئے ہیں، اتنے ہی موزوں و مناسب جوابات موصوف نے بھی دیے ہیں۔معلومات میں مزید اضافہ بھی ہوا، سچ پوچھیے تو کچھ تشنگی کا احساس بھی ہوا۔مضامین ادبی لحاظ سے بڑے معیاری اور وزنی ہیں ساتھ ہی غزلیں ،افسانے اور تبصرے وغیرہ نے رسالہ میں مزید چار چاند لگا دیا ہے۔

ٹکنالوجی کے اس تیز رفتار زمانہ میں اردو کے قارئین کی دلچسپیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سہ ماہی رسالہ کو انفرادی طور سے جو Look دیا ہے وہ آپ کی صحافتی بصارت کو اجاگر کرتا ہے۔آپ کی اس پیش رفت کی گونج یقیناً اردو بستیوں کے حلقۂ ادب میں تا دیر سنائی دے گی۔نئے تخلیق کاروں کی ادبی کاوشوں کو اشاعتی موقع فراہم کرانے میں ان کی شناخت کی پیش قدمی کو لائق تحسین تصور کیا۔میری طرف سے ایک بار پھر مبارکباد اور ساتھ میں میری نیک خواہشات بھی قبول فرمائیں۔

داؤد احمد

(محمود آباد،سیتاپور)

□□□

پروفیسر محمود الٰہی کی پہلی برسی کے موقع پر ڈاکٹر سلیم احمد کی لکھنؤ واقع رہائش گاہ پر منعقد ایک تقریب میں
سامعین کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام (اوپر) ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی (درمیان) اور تقریب میں موجود سامعین (نیچے)

Urdu Quaterly

Vol 02 Issue 02
March - May 2019

Adbee Nasheman
Lucknow - 226 003

RNI No. UPURD / 2017 / 74845
Per Copy : 25/-
Annaul Subscription : 125/-

Printed,Published & Prop. by **Ahmad Rashiq** at **Nomani Printing Press, Baroodkhana, Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168, Almas Bagh, Hardoi Road, Lucknow **Editor: Dr. Saleem Ahmad**